اسلام کی اجتہادی روایت کا ترجمان

اجتہاد

اسلام آباد

شمارہ نمبر ۱۳
دسمبر ۲۰۲۰ء

مسلم عائلی قوانین: فکری وعصری مباحث

اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اسلام آباد

اسلام کی اجتہادی روایت کا ترجمان

اجتہاد

شمارہ: ۱۳۰ دسمبر ۲۰۲۰

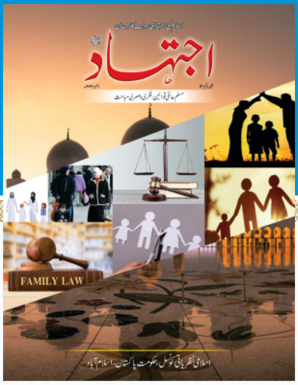

تقدیم — ڈاکٹر قبلہ ایاز

اداریہ — ڈاکٹر اکرام الحق

مسلم عائلی قوانین: فکری و عصری مباحث

۱۔ قرآن و سنت کا تصور نکاح اور کم سنی کی شادی: ایک تحقیقی جائزہ — پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد قیوم — ۷

۲۔ نکاح سے قبل طبّی معائنہ، فقہائے مالکیہ کا مؤقف اور قانون سازی کے لیے تجاویز: ایک تحقیقی مطالعہ — مفتی غلام ماجد — ۱۷

۳۔ نکاح نامے میں خون ٹیسٹ اور اس کے نتیجے کا اندراج — ڈاکٹر انعام اللہ — ۲۱

۴۔ کورٹ میرج اور ولی کا اختیارِ نکاح: شرعی و قانونی پہلو — مفتی یاسر احمد زیرک — ۲۵

۵۔ اسلامی قانون میں طلاقِ ثلاثہ کا تنقیدی جائزہ — عائشہ جدون — ۳۵

۶۔ مسلم فیملی لا آرڈیننس ۱۹۶۱ء: وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں ایک تجزیہ — ڈاکٹر حبیب الرحمان — ۴۱

۷۔ اسقاطِ حمل و جنین: چند اہم سوالات — ڈاکٹر محمد مشتاق احمد — ۶۰

۸۔ مرد و زن کا میل جول: شرعی مؤقف کی تفہیم — اشفاق احمد — ۶۸

۹۔ یتیم پوتے کی وراثت: ایک شرعی و قانونی جائزہ — ڈاکٹر عبد الحی ابڑو — ۸۴

۱۰۔ ہائر انسٹیٹیوٹ برائے فتویٰ شریعہ اکیڈمی کا تین طلاق کو ایک طلاق رجعی قرار دینے کا فتویٰ — مفتی عبد الرشید — ۹۱

۱۱۔ مسلم فیملی لاز آرڈی نینس کی تنسیخ کا بل ۱۹۶۲ء: قومی اسمبلی کی کارروائی — ڈاکٹر اکرام الحق — ۹۵

مکالمہ و گفتگو

نکاح کے معاصر مسائل — مفتی محمد زاہد (شیخ الحدیث، جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد) — ۱۰۷

تبصرہ کتب

۱۔ تین طلاق ایک سماجی المیہ (محمد تہامی بشر علوی) — مفتی غلام ماجد — ۱۲۵

۲۔ ایک مجلس میں تین طلاقیں (حافظ صلاح الدین یوسف) — محمد زبیر ابڑو — ۱۳۱

۳۔ Quran and Woman (Amina Wadud) — یاسر احمد زیرک — ۱۳۳

۴۔ Feminist Edges of the Qur'an (Ayesha A. Hidayatullah) — یاسر احمد زیرک — ۱۳۵

سفارشات و سرگرمیاں

۱۔ کونسل کے اجلاس اور سفارشات — ۱۳۹

۲۔ فکری نشست بابت "امریکی انخلا کے بعد خطے کی صورتِ حال: خدشات و امکانات" — ۱۵۰

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر قبلہ ایاز

مدیر مسئول

ڈاکٹر اکرام الحق

مدیر

یاسر احمد زیرک

مجلس ادارت

مفتی محمد زاہد، ڈاکٹر محمد خالد مسعود،
ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن، خورشید احمد ندیم
ڈاکٹر محسن مظفر نقوی، ڈاکٹر ساجد شہباز خان،
ڈاکٹر انعام اللہ

مجلس مشاورت

مولانا زاہد الراشدی، ڈاکٹر طفیل ہاشمی،
جسٹس (ر) سید منظور حسین گیلانی
ڈاکٹر سید محمد انور، ڈاکٹر محمد ضیاء الحق
مفتی محمد راغب نعیمی

ناشر

ڈاکٹر اکرام الحق، سیکرٹری
اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

ڈیزائن و پیشکش

شہزاد اقبال فاروقی، محمد ذوہیب، عادل لطیف
شعبہ اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل

زیر اہتمام

۴۶، اتاترک ایونیو، جی۔۵/۲، اسلام آباد
فون: ۰۵۱۔۹۲۴۵۹۹۳ فیکس: ۰۵۱۔۹۲۱۷۳۸۱
ای میل: contact@cii.gov.pk
ویب سائٹ: www.cii.gov.pk

جملہ حقوق محفوظ ۲۰۲۰ء

ادارہ کا مضمون نگار خواتین و حضرات کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

نکاح کے معاصر مسائل

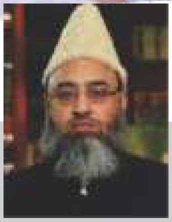

مفتی محمد زاہد
شیخ الحدیث جامعہ امدادیہ فیصل آباد

سب سے پہلے تو میں اسلامی نظریاتی کونسل اور خاص طور پر اس کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری باتیں اسلامی نظریاتی کونسل کے پلیٹ فارم اور اس کے عملے کے ذریعے لوگوں تک پہنچائی جائیں۔

ا۔ اسلام کا تصور نکاح اور اس کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟

نکاح وہ ادارہ ہے جو انسان کے لیے فطری بھی ہے اور وحی کی آسمانی تعلیمات کا حصہ بھی۔ حضرت حذیفہؓ کی ایک حدیث ہے صحیح مسلم وغیرہ میں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امانت اور امانت داری کو لوگوں نے دو جگہ سے سیکھا ہے، ایک فطرت سے کہ اللہ تعالی نے انسان کی فطرت میں یہ رکھا ہے کہ امانت اچھی چیز ہے۔ فطرت کے بعد لوگوں نے امانت کو قرآن وسنت اور وحی کی تعلیمات سے سیکھا ہے۔ بہت سارے احکام شرعیہ کی یہی نوعیت ہے کہ انسان کے لیے فطری بھی ہیں اور اس حوالے سے آسمانی تعلیمات بھی موجود ہیں۔ نکاح بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہ انسان کی فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہش کی تسکین بھی چاہتا ہے، اپنی نسل کو بڑھانا بھی چاہتا ہے اور یہ بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ سب کچھ ایک منظم طریقے سے ہو، بدنظمی کے ساتھ نہ ہو۔ چنانچہ نکاح یا خاندان کا ادارہ تب سے موجود ہے جب سے نسلِ انسانی دنیا میں موجود ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی یہی بات بتلائی ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے آدم کو پیدا کیا اور اس کے بعد پھر ان کی زوجہ یعنی حضرت حواؑ کو اللہ تعالی نے پیدا کیا اور ان دونوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مزید انسانوں کو پیدا کیا۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں اللہ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔ اسی طرح نکاح کے ادارے کی اہمیت کو قرآن وسنت نے بھی بیان کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ نکاح مرسلین یعنی رسولوں کی سنت ہے اور ان کا طریقہ ہے اور اس کی تائید قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالی نے پہلے رسولوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان رسولوں کی خاندانی زندگی تھی، ان کی بیوی بچے تھے۔

نکاح کے مقاصد کیا ہیں؟

نکاح کے گرد گھومنے والے بنیادی اسلامی اصولوں کو اگر ہم دیکھیں تو شاید ہم اپنی ساری گفتگو اور اپنی ساری بات کو چند نکات میں جمع کر سکتے ہیں اور انھی کو ہم نکاح کے مقاصد بھی کہہ سکتے ہیں۔ سب سے بڑا مقصد جس کو قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے وہ زندگی کو پُر سکون بنانا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآنِ کریم نے عربی زبان کے حرف "ل" کے ساتھ ذکر کیا ہے جو کسی چیز کا مقصد بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الروم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے، اللہ کے احسانات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس میں سے تمہاری ہی نوع میں سے تمہاری ازواج (خاوند یا بیوی) پیدا کی ہیں اور مقصد اس کا یہ ہے کہ اس سے تمہیں سکون حاصل ہو اور اس پر دو اضافی نتیجے یہ مرتب ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس رشتے میں مودت بھی رکھی ہے اور رحمت بھی۔ اسی طرح سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک جان کو پیدا کیا یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو پھر انہی سے ان کی زوجہ یعنی حضرت حوا علیھا السلام کو پیدا کیا تاکہ اس سے سکون حاصل کریں، سکون دل کا بھی ہوتا ہے۔ جس کو ہم اطمینان کہتے ہیں اور سکون زندگی کا ٹھہراؤ ہے۔ سکون زندگی کا اضطراب سے محفوظ ہونا ہے اور اضطراب سے حفاظت تبھی ہوتی ہے جب زندگی منظم ہو اور طے شدہ قواعد وضوابط، فرائض اور واجبات کے تحت چل رہی ہو۔ تو نکاح کے مقاصد میں پہلا مقصد تو سکون ہے۔

دوسری چیز یہ کہ اولاد اور نسل کی خواہش انسان کی فطرت ہے، اور صرف انسان کی نہیں بلکہ ہر جاندار چیز کی فطرت ہے۔ ہر جاندار کو موت آنی ہے، جب کوئی جاندار یہ سوچتا ہے کہ مجھ پر موت آنی ہے، بطور فرد کے میں نے ختم ہو جانا ہے تو اس کے اندر یہ خواہش ہوتی ہے کہ بطور فرد تو میں ختم بھی ہو جاؤں، تو بطور نوع کے میں اپنے آپ کو موجود رکھوں یعنی میرے خاتمے کے بعد بھی میرا نشان دنیا میں موجود رہے۔ اس مقصد کے لیے ہر زندہ چیز میں اولاد کی اور نسل بڑھانے کی خواہش کسی نہ کسی انداز سے، کسی نہ کسی طریقے سے موجود ہوتی ہے۔ اللہ چونکہ فنا سے بالکل محفوظ ہیں، وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہنے والے ہیں، اس لیے جن لوگوں نے اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں خاص طور پر سورۃ مریم کے آخری رکوع میں اُن کے بارے میں بہت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں اور شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے لیے اولاد کو ماننا اللہ کی صفتِ بقا کی نفی ہے۔ تو اولاد کی خواہش فطری ہے،

انسان کی اگر فطرت بگڑی ہوئی نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے کسی نہ کسی انداز میں اولاد کی شکل اپنی بقا کی خواہش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح یا مرد و عورت کے تعلق یا زوجیت کا جو رشتہ قائم کیا ہے جو در حقیقت نکاح ہی سے وجود میں آتا ہے اس کے نتائج میں بھی اسی کا ذکر کیا۔ چنانچہ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی نوع میں سے تمہاری ازدواج پیدا کیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ذریعہ بنایا
اولاد اور اولاد کی اولاد کا یعنی بیٹے، بیٹیوں کا، پوتے، پوتیوں کا، نواسے نواسیوں کا ذریعہ بنایا۔

تیسری چیز اور نکاح کا تیسرا بڑا مقصد خاندان کی تنظیم ہے۔ انسان کی یہ خواہش فطری ہے کہ اس کی اولاد ہو اور شریعت میں بھی یہ چیز مطلوب ہے، لیکن اسلام اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ جس طریقے سے باقی جاندار چیزیں غیر منظم انداز سے بعض اوقات اپنی نسل کو بڑھا رہی ہوتی ہیں، انسان بھی اسی طریقے سے کرے، کیونکہ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے تمدن رکھا ہے۔ اللہ کی نظر میں پیدا ہونے والا بچہ بہت نازک چیز ہے۔ وہ مادی اعتبار سے بھی نازک ہے اور اس کی سماجی، اخلاقی اور دوسری نوعیت کی جو ضروریات ہیں، ان میں بھی نزاکت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ دو مرد اور عورت غلط انداز سے اولاد کو وجود میں لے آئیں۔ اپنی نسل کو بڑھائیں، یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے اور کسی بھی دین اور مذہب نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے اسلام کی رو سے بھی نکاح کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ آپ اولاد کی خواہش بلکہ ضرورت کو پورا کریں، لیکن اس کو پورا کرنے سے پہلے خاندان کا ادارہ وجود میں لائیں تاکہ بچے کے آنے سے پہلے ایک منظم ادارہ موجود ہو جس میں حقوق اور فرائض ہوں، ہر شخص دوسرے سے اپنے حق کا مطالبہ بھی کر رہا ہو اور اس کے حقوق بھی ادا کر رہا ہو، تاکہ یہ ادارہ بحیثیت ادارہ اس نئے ننھے وجود کی ذمہ داری اُٹھائے اور ہر ایک کو پتہ ہو کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ میرے ذمے کیا فرض عائد ہوتا ہے اور اس معاملے میں میرا حق کیا ہے۔ اس لیے تنظیم الأسرۃ یا خاندان کو منظم کرنا بھی اسلام میں نکاح کے مقاصد میں سے ہے۔ اس کا ایک تعلق تو پچھلے مقصد سے بہر حال جُڑا ہوا ہے یعنی اولاد والے مقصد سے۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی کی تشکیل اور اس کی تنظیم مختلف سطح پر ہوتی ہے، مثلاً آج کل ریاست کے Level پر ہوتی ہے، پھر ریاست کے نیچے حکومتوں کے مختلف Level ہوتے ہیں۔ اس سطح پر تنظیم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو منظم بنانے کے لیے یہ چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم بہت چھوٹی سطح پر اور Gross root level پر کی جائے اور وہ تنظیم خاندان کی سطح کی تنظیم ہے۔ خاندان بنیادی طور پر دو رشتوں کا نام ہے: مرد اور عورت کا رشتہ یعنی میاں بیوی کا رشتہ، یہ سب سے پہلے وجود میں آتا ہے اور پھر اولاد کا اپنے والدین سے رشتہ جو اس کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ اس سے آگے جب یہی بچے بڑے ہوں گے۔ انہوں نے شادیاں کر لیں تو اب ایک نیا خاندان وجود میں آجائے گا جو اگرچہ اپنے آپ کو خاندان سے Attach رکھتا ہے، لیکن بہر حال یہ ایک نیا خاندان ہے جو پچھلے خاندان کے اندر سے نکلا ہے۔

نکاح کا چوتھا مقصد جو اب تک کی گفتگو سے سمجھ میں آ ہی چکا ہے وہ ہے "جنسی ضرورت کی تکمیل"۔ جس طرح انسان کو کھانے کی بھوک لگتی ہے، پینے کے پیاس لگتی ہے، نیند آتی ہے اسی طرح جنسی تعلق بھی انسان کی ایک قسم کی بھوک ہے۔ اس بھوک کو مٹانا انسان کی فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ تو تمام مذاہب اور اسلام کی خواہش ہے کہ یہ تقاضا پورا ہو، کیونکہ یہ نازک معاملہ ہے، اس لیے یہ ایک منظم طریقے سے وجود میں آنا چاہیے۔ پہلے دو شخص حقوق و فرائض کے اعتبار سے خاص نوعیت کا رشتہ قائم کریں اور اس کے بعد پھر اپنی اس خواہش یا اس ضرورت یا اس بھوک کو مٹانے کی تکمیل کریں۔

پانچویں چیز یہ ہے کہ صرف یہ نہیں کہ اسے یعنی جنسی خواہش پورا کرنے کو ایک ضرورت کا درجہ دیا جائے، بلکہ اس سے آگے بھی ایک بات ہے۔ ضروریات کو پورا کرنے میں ہم محض ضرورت پورا کرنے تک نہیں رہتے۔ ہم کھاتے ہیں مگر ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا کھانا مزیدار بھی ہو۔ ہم پیتے ہیں اور ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا مشروب مزیدار بھی ہو اور ٹھنڈا بھی ہو۔ ہم پہنتے ہیں لیکن پہننے میں صرف ضرورت کو نہیں دیکھتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ لباس خوبصورت اور آرام دہ بھی ہو۔ ہم رہائش اختیار کرتے ہیں اور اس میں صرف ضرورت کو پورا نہیں کرتے بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہونا چاہتے ہیں، اس طرح ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہماری رہائش خوبصورت اور آرام دہ ہو۔ جس طرح کھانے، پینے اور لباس میں اللہ تعالیٰ نے صرف ضرورت کی حد تک رہنے کی بات نہیں کی بلکہ ہمیں اجازت دی ہے کہ ان چیزوں سے ہم اپنی زندگی کو پر لطف بھی بنائیں، اسی طریقے سے جنسی ضرورت کی تکمیل بھی انسان کی ایک بھوک ہے، انسانی ضرورت ہے۔ اس کو اسلام یہ نہیں کہتا کہ آپ لازمی ضرورت کی حد تک ہی رہیں بلکہ اس کو لطف اندوزی کا ذریعہ بھی بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ پہلے جو مقاصد ہم نے ذکر کیے ہیں، ان مقاصد کے دائرے کے اندر ہو، بات اس سے باہر نہ نکلے۔ یہودیوں کے مزاج میں چونکہ خشکی بہت زیادہ غالب تھی اور وہ شریعت کو زندگی کے جکڑنے کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے، اس لیے مرد اور عورت کے تعلق میں بھی انہوں نے بعض جکڑنیں شریعت کے نام پر پیدا کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۲۳ نازل کی۔ اسی طریقے سے بعض جکڑنیں وہ ایسی پیدا کرنا چاہتے تھے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں اس طرح کی کوئی جکڑن نہیں ہے، اس ساری بات کے پیچھے یہ یہودی تصور تھا کہ منکوحہ عورت سے تعلق بھی محض اولاد کی خاطر ہونا چاہیے، اس کے علاوہ اپنی منکوحہ سے تعلق بھی ممنوع اور ناجائز ہو گا۔ قرآن نے اس طرح کی بحثوں کے جواب میں لفظ تو حرث یعنی کھیتی کا استعمال کیا، جس میں اشارہ تھا کہ نسل چلانا اس تعلق کا اہم مقصود ہے مگر قرآن و حدیث نے بتایا کہ حلال دائرے میں رہتے ہوئے محض لطف

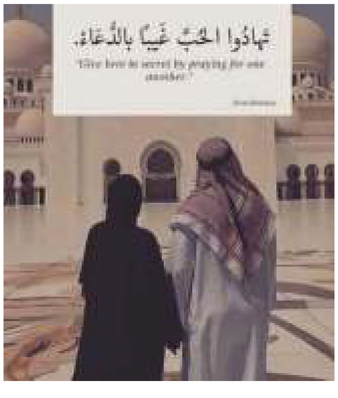

اندوزی بھی کوئی شجرۂ ممنوعہ نہیں ہے، کھیتی میں آپ محض ہریالی سے لطف اندوز ہونے کے لیے آتے ہیں تو ایک دائرے کے اندر یہ بھی ممنوع نہیں ہے۔

چھٹی بات نکاح کا مقصد صرف جنسی ضرورت کو پورا کرنا نہیں ہے، اس تعلق لطف اندوز بنانے یا اس سے لطف اندوز ہونے پر بھی بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ ایک خاص دائرے کے اندر رہ کر اپنی ضرورت کو پورا کر کے انسان کی اس انداز سے تسلی اور اطمینان ہو جائے کہ وہ ادھر اُدھر توجہ کرنے سے رک جائے۔ مختصر لفظوں میں کہہ لیجیے کہ پاک دامنی کا حصول بھی نکاح کے مقاصد میں شامل ہے، یعنی شادی کے بندھن کو بھی اسلام نے پاک دامنی کے حصول کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ یعنی یا جنسی خواہش اور اس نوعیت کے ارادوں کا مقابلہ کرنا اور اس کو کنٹرول کرنا بھی اسلام کے مقاصد میں شامل ہے۔ مغربی دنیا میں جنسی خواہش کو صرف ایک خواہش تسلیم کیا گیا ہے یہ سوچ کر کہ جیسے بھی یہ پوری ہوتی ہے ہونی چاہیے لیکن اسلام اور دیگر ادیان یہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کو پورا کرنے کا بندوبست بھی کرنا ہے لیکن پورا کرا بھی دیں تو یہ ایک ایسی چیز ہے کہ انسان پھر بھی اِدھر اُدھر منہ مارنا چاہتا ہے، اس لیے انسان کو کنٹرول کرنا سکھانا بھی ضروری ہے۔ اس لیے نکاح کے مقاصد میں یہ بھی علماء نے بیان کیا ہے کہ اس کے ذریعے انسان کو ایک عفت اور پاکدامنی حاصل ہوتی ہے اور انسان جنسی بد نظمی کی خواہش کو کنٹرول کرنے کی زیادہ صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔

۲۔ اسلام میں ولی کے اختیارِ نکاح کی حدود کیا ہیں اور ان کی روشنی میں دورِ حاضر میں کُفو کا تعین کیسے کیا جائے گا؟ ہم چاہتے ہیں کہ اس سلسلے میں چند اصولی معیارات ہمارے سامنے آجائیں۔

اس سوال میں دو چیزوں کے بارے میں پوچھا گیا ہے ایک ولایت اور دوسرے کفاءت۔ ولایت کا مطلب یہ ہے کہ کسی لڑکے یا لڑکی یا کسی مرد یا عورت پر اس کے نکاح کے بارے میں اس کے خاندانی سرپرست مثلاً اس کے والد، اس کے بڑے بھائی، اس کے چچا وغیرہ کو کتنا اختیار حاصل ہے اور اپنے خاندانی سرپرست کے مقابلے میں خود اس لڑکے یا لڑکی کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اُٹھانے کا کتنا اختیار حاصل ہے۔ کفاءت کا مطلب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا آپس میں نکاح ہو رہا ہے وہ دینی، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کے کتنے ہم پلہ ہیں، اور ہم پلّہ نہ ہونے کی صورت میں کسی فریق کو اعتراض کا کتنا حق حاصل ہے۔ ولایت اور کفاءت کا بعض جگہ جا کر بہت گہرا تعلق بن جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سارے احکام مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں ہم دونوں چیزوں کو پہلے الگ الگ دیکھیں گے۔

سب سے پہلے ہم بات کریں گے ولایت کی، ولایت یعنی خاندانی سرپرست کا فیصلہ کرنے یا قدم اُٹھانے کا اختیار۔ ممکنہ طور پر یعنی عقلی امکان کی حد تک خاندانی سرپرست کو یہ اختیار ایک عاقل بالغ لڑکے پر بھی ہو سکتا ہے اور لڑکی پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس بات پر عملاً فقہاء کا تقریباً اتفاق ہے کہ عاقل و بالغ لڑکے پر اس کے خاندانی سرپرست کو اپنا فیصلہ نافذ کرنے یا اس کے بارے میں کوئی قدم اُٹھانے یا اس کی رضا کے بغیر اس کے نکاح کرانے کا کوئی قانونی اختیار حاصل نہیں۔ ہاں البتہ سماجی سطح پر ہمارے ہاں یہ مسئلہ ضرور ہے کہ ایک رشتے میں بالغ لڑکے یا لڑکی کی اپنی رائے اپنی پسند جو شامل ہونی چاہیے، وہ ہو پاتی ہے یا نہیں ہو پاتی۔ اگر کوئی رشتہ جو اس کے والدین طے کر رہے ہیں، کسی لڑکے کو پسند نہیں ہے تو کیا ہمارے سماج میں لڑکے میں اتنی ہمت اور جرأت ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین کے آگے نا کر سکے۔ اس بنیاد پر اس کو والدین کا گستاخ یا نافرمان تو نہیں کہا جاتا اور اس پر اپنے والدین کا فیصلہ ماننے کے لیے کوئی سماجی دباؤ تو نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی عاقل بالغ لڑکا سرپرست کے رائے کے بغیر قدم اٹھاتا ہے تو معاشرتی طور پر اسے کتنا قابلِ قبول سمجھا جا سکتا ہے، یہ سماجی نوعیت کے ایشو ہیں، لڑکے پر سرپرست کا کوئی قانونی اختیار بہر حال نہیں ہے، جس طرح لڑکی کے بارے میں ہوتا ہے، اس لیے لڑکے کا معاملہ اتنا بڑا ایشو نہیں ہے، جتنا کہ ولایت اور سرپرست کے اختیار کا ایشو لڑکی کے بارے میں ہوتا ہے۔

ایک لڑکی کا اپنا اختیار کس حد تک ہے اور اس کے والدین یا اس کے خاندانی سرپرست کا اختیار کس حد تک ہے؟ ہمارے ہاں یہ ایک سنجیدہ فقہی ایشو بھی ہے کیونکہ فقہا کے اس میں مختلف اقوال موجود ہیں اور ہماری اعلیٰ عدالتوں میں اس مسئلے پر تفصیلی بحثیں بھی ہو چکی ہیں اور متعدد فیصلے اس پر آچکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بہت بڑا نازک سماجی ایشو بھی ہے۔ اس بارے میں پہلے ہم نے دیکھنا ہے کہ فقہاء کے اس مسئلے پر کیا رجحانات ہیں؟ پھر ہم اپنے ملک کی عملی صورتِ حال اور خاص طور پر اس سے جڑے بہت سارے سماجی ایشو ہیں، ان پر بات کرنے کی کوشش کریں گے۔

لڑکی پر ولایت کے معاملے کے دو بنیادی رُخ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی ایسا موقع آجاتا ہے کہ لڑکی کا خاندانی سرپرست جس کو آگے ہم ولی سے تعبیر کریں گے، وہ کوئی قدم اُٹھاتا ہے، یا فیصلہ کرتا ہے اور لڑکی کی اپنی رضامندی اس میں شامل نہیں ہوتی تو کیا اس ولی کو اس طرح کا اختیار حاصل ہے اور وہ اگر کسی جگہ نکاح کرا دے تو وہ منعقد ہو جائے گا اور کیا اس لڑکی پر اس نکاح کو ماننا لازم ہو گا۔ اگر وہ انکار کر دے تو بھی کیا وہ نکاح ہو گا؟ ایک سوال یہ ہے کہ ولی اپنی مرضی چلانا چاہتا ہے اور لڑکی اس کو نہیں مان رہی تو شریعت کیا کہتی ہے اور دوسرا رُخ اس کے اُلٹ ہے کہ لڑکی اپنی مرضی کرنا چاہتی ہے یعنی وہ کسی جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا ولی اس میں رکاوٹ بن رہا ہے یا ولی سے پوچھے بغیر وہ قدم اُٹھا لیتی ہے اور ولی کی نظر میں اس کا یہ اقدام درست نہیں ہے تو کیا عورت نے یا لڑکی نے ولی کی رضامندی کے بغیر اور اس کو شامل کیے بغیر جو قدم اُٹھایا ہے یہ نافذ العمل ہو گا؟ حاصل یہ کہ بعض اوقات ولی لڑکی سے پوچھے بغیر قدم اٹھاتا ہے کیا وہ نافذ العمل ہو گا اور لڑکی ولی سے پوچھے بغیر کوئی قدم اُٹھاتی ہے تو کیا وہ نافذ العمل ہو گا؟ ولایت کے مسئلے کے یہ بنیادی دو سوال ہیں۔

ان سوالات کو فقہاء نے کس طریقے سے دیکھا ہے۔ اس میں اگر ہم تمام فقہاء کے اقوال کی تفصیلات میں جائیں گے تو بات لمبی ہو جائے گی، لیکن تین بنیادی

رجحانات کو ہم دیکھ سکتے ہیں اور ان رجحانات میں فقہ اسلامی کا ایک بڑا حصہ بعض ماننے والوں کے اعتبار سے اور دنیا میں عمل کرنے کے اعتبار سے ایک بڑا حصہ Cover ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک رجحان امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اس معاملے میں ولی کو اہمیت تو دیتے ہیں لیکن اس کی اہمیت ان کے نزدیک محدود ہے اور خود لڑکے یا لڑکی کی اہمیت زیادہ ہے۔ گویا امام ابو حنیفہؒ اس معاملے کو بنیادی طور پر فرد کی آزادی اور فرد کے فیصلہ کرنے کے اختیار کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، چنانچہ کسی ولی کو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کسی جگہ کرادے۔ اگر اس نے نکاح کرادیا تو یہ نکاح فضولی کے نکاح کی طرح ہے یعنی میں نے کسی کو اپنا وکیل نہیں بنایا تب بھی اس نے میرے Behalf پر کوئی Contract کر لیا، اس کو فضولی کہا جاتا ہے، جس طرح فضولی کے معاملے میں اصل شخص کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس Contract کو مانے یا نہ مانے اسی طرح ولی نے لڑکی سے پوچھے بغیر اگر نکاح کر دیا ہے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک لڑکی اگر اسے قبول کر لیتی ہے تو وہ نکاح ہو جائے گا اور اگر وہ انکار کرتی ہے تو نکاح کالعدم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر لڑکی اپنی مرضی کرتی ہے اور وہ ولی کو اپنے اعتماد میں نہیں لیتی تو امام ابو حنیفہؒ بیشتر صورتوں میں یہ فرماتے ہیں کہ یہ نکاح منعقد ہو جائے گا۔ الا یہ کہ اس نکاح کے نتیجے میں ولی کا کوئی نقصان ہو، کوئی ضرر ہو اور وہ ضرر زیادہ تر اس صورت میں ہوتا ہے کہ لڑکی نے کسی ایسی جگہ رشتہ کر لیا ہے جو سماجی سطح پر اس کے خاندان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے اور یہیں آ کر کفاءت کا مسئلہ ولایت کے مسئلے کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں امام ابو حنیفہؒ ولی کو بھی مداخلت کا اختیار دیتے ہیں جس کی تفصیل فقہ حنفی کی کتابوں میں موجود ہے، ورنہ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ اخلاقی طور پر لڑکی کو بھی چاہیے تھا کہ وہ اپنے بڑوں کو آگے کرتی اور اُن کے ذریعے سے یہ سب کراتی لیکن قانونی سطح پر وہ نکاح منعقد ہو جائے گا اور ایک عدالت قانون اس نکاح کو نافذ قرار دے گی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ لڑکی کو زیادہ بااختیار بنا رہے ہیں اور ولی کا اختیار اس کے مقابلے میں کم ہے اور بہت محدود ہے۔ گویا انسان کی اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی جو آزادی ہے، یا اس بارے میں جو انسان کا اختیار ہے، اس کو امام ابو حنیفہؒ پہلے نمبر پر رکھتے ہیں اور دوسرے کو اگر کسی وجہ سے اعتراض ہو سکتا ہے تو اس کو قابلِ قبول ماننے کے لیے اس کی معقولیت کو دیکھنے کی بات کرتے ہیں۔

دوسرا رجحان وہ ہے جس کی نمائندگی امام شافعیؒ کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ کا جو نقطۂ نظر ہے اس میں وہ اکیلے نہیں ہیں، وہ بہت سارے فقہاء کا ہے، لیکن چونکہ دنیا میں فقہ حنفی کے بعد سب سے زیادہ عمل فقہ شافعیؒ پر ہوتا رہا ہے، اس لیے ہم صرف امام شافعی کو اس معاملے میں مدنظر رکھیں گے۔ کہیں کہیں ہم دوسرے فقہاء کی بھی درمیان میں بات کر لیں گے۔ امام شافعیؒ پہلے سوال کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اگر ولی نے لڑکی کا نکاح کرادیا اور کفو میں کرایا ہے، یعنی ہمسری اور ہم پلّہ ہونے کا لحاظ رکھا ہے تو عاقل بالغ لڑکی کو وہ فیصلہ ماننا پڑے گا اور اس پر وہ نافذ ہو جائے گا اور وہ نکاح منعقد ہو جائے گا، گویا یہاں ولی کی بات مانی گئی ہے۔ اور اگر ولی کے پہل کرنے کی بجائے ایک لڑکی پہل کر لیتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے کسی جگہ اپنا نکاح کر لیتی ہے، اس میں ولی کی رضامندی اور اجازت شامل نہیں تھی تو امام شافعیؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ نکاح منعقد نہیں ہوا۔ لیکن یہ بات تھوڑی تفصیل طلب ہے جو ہم آگے چل کر کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام شافعیؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ولی نے پہل کر لی تو اس کی بات لڑکی پر چل جائے گی اور اگر لڑکی نے پہل کر لی تو اس کی بات نہیں چلے گی جب تک کہ ولی اس کی اجازت نہ دے دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام شافعیؒ کا رجحان امام ابو حنیفہؒ کے بالکل الٹ ہے۔ وہ ولی کو زیادہ طاقت ور بنا رہے ہیں اور اس کے مقابلے میں لڑکی کا اختیار ہمیں محدود نظر آتا ہے۔ اگرچہ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی وہ اتنا محدود نہیں ہے جتنا بعض اوقات سمجھ لیا جاتا ہے۔ گویا حاصل یہ ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک لڑکی تو ولی کی پابند ہے لیکن ولی لڑکی کا پابند نہیں ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ولی تو لڑکی کا پابند ہے یعنی لڑکی سے اجازت لینے کا، لیکن لڑکی ولی کی پابند نہیں ہے۔

تیسرا رجحان امام ابو حنیفہؒ کے دو جلیل القدر شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں کے اختیارات میں توازن رکھا جائے اور دونوں کو ایک دوسرے کا پابند بنا دیا جائے، لہٰذا پہلے سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اگر ولی نے عورت سے پوچھے بغیر اپنی مرضی چلانا چاہی تو وہ مرضی نہیں چلے گی اور نکاح منعقد نہیں ہو گا۔ گویا ولی نے کوئی قدم اُٹھانا ہے تو لڑکی کو منانا ضروری ہے اور اگر لڑکی کوئی قدم اُٹھانا چاہتی ہے تو دوسرے سوال کے جواب میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ جب تک لڑکی اپنے ولی کو ساتھ نہیں ملائے گی اور اپنے طور پر کوئی قدم اُٹھائے گی تو وہ نکاح نافذ نہیں ہو گا۔ گویا ولی لڑکی کی بات کا پابند ہے، یعنی اس سے پوچھنے کا پابند ہے اور اس کو ساتھ ملانے کا پابند ہے اور لڑکی اپنے ولی کو ساتھ ملانے کی پابند ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ تو ایک رجحان یہ ہوا کہ اختیارات کا رجحان زیادہ لڑکی کی طرف رکھا جائے، کیونکہ اسی کی ذات کے بارے میں فیصلہ ہے اور انسان کو اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ اس معاملے میں ولی کا پلڑا بھاری رکھا جائے۔ یہ دوسرا رجحان امام شافعیؒ کا ہے اور تیسرا یہ کہ دونوں کے اختیارات میں اس طریقے سے توازن قائم کر دیا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے پابند ہوں۔ یہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا نقطۂ نظر ہے۔ یہ جو تین رجحان ہیں اس میں عالم اسلام کی بیشتر Practices تقریباً Cover ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد بہت تھوڑے تھوڑے رجحانات باقی رہ جاتے ہیں، ان کی تفصیل میں جائیں گے تو بات لمبی ہو جائے گی۔

یہاں امام شافعیؒ کے رجحان کے مطابق بادی النظر میں یہ لگ رہا ہے کہ لڑکی کو بالکل ہی جکڑ دیا گیا ہے اور سارے کا سارا اختیار اس کے ولی کو دے دیا گیا ہے۔ اس

لیے یہاں ضرورت ہے کہ امام شافعیؒ نے نقطہ نظر کو تھوڑا سا تفصیل سے سمجھیں اور اسی سے ہمیں پتہ چلے گا کہ دیکھنے میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا نقطہ نظر ایک دوسرے کے بالکل اُلٹ نظر آرہا ہے۔ حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ دونوں کے نقطہ نظر میں بہت معمولی سا فرق باقی رہ جاتا ہے، ورنہ بنیادی اصولوں اور بنیادی مقاصد میں دونوں تقریباً مشترک ہیں۔ امام شافعیؒ کا استدلال بنیادی طور پر تو نصوص سے ہے۔ ایک قرآن کریم کی آیت اور ایک حدیث سے ہے اور اس کے تناظر میں ہم امام شافعیؒ کے مذہب کی تفصیل کو دیکھنا چاہیں گے اور پھر دوبارہ امام ابو حنیفہؒ کی طرف آئیں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ ہمارے ماحول میں اس کا اطلاق کس طریقے سے ہو سکتا ہے؟

سورۃ البقرہ کی آیت ہے کہ کوئی عورت تماری ولایت میں ہے یعنی تم اس کے سرپرست ہو۔ تمہاری بیٹی ہے، بہن ہے، اس کو طلاق ہو گئی ہے۔ طلاق ہو جانے کے بعد وہ اسی خاوند سے یا کسی اور شخص سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتی ہے اور دونوں مرد اور عورت راضی ہیں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اس عورت کے ولی اور سرپرست کو، اس کے والد، بھائی یا اس کے چچا وغیرہ کو یہ ہدایت دے رہے ہیں کہ تمہیں اس کے فیصلے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ یہاں یہ ذہن میں رکھیں کہ مطلقہ کی بات آیت میں اس لیے ہوئی ہے کہ اس کا شانِ نزول ایک مطلقہ کا واقعہ تھا، ورنہ امام شافعیؒ اور باقی فقہاء بھی اس آیت کو طلاق یافتہ عورت کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے۔ تو امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ولی کو روکنے سے منع فرمایا ہے اور منع اس کام سے کیا جاتا ہے جس کے کرنے کا قوی امکان ہو تو پتہ چلا کہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک ولی کسی عورت کو اپنی رضامندی سے فیصلہ کرنے سے روکے اور یہ امکان تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ ولی کے پاس روکنے کا اختیار بھی موجود ہو۔ اگر وہ بے اختیار ہے تو پھر تو روکنے کا کوئی امکان ہی نہیں تو اس سے منع کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ ولی کے پاس یہ اختیار موجود ہے کہ اس کے زیرِ ولایت کوئی عورت اپنے بارے میں خود فیصلہ کرتی ہے تو وہ ویٹو کر دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب وہ دونوں راضی ہیں تو تمھیں Veto کرنا نہیں چاہیے اور تمھیں اس میں رکاوٹ بننا نہیں چاہیے۔ تو اس سے امام شافعیؒ کا یہ استدلال ہے کہ ایک ولی کے پاس رکاوٹ بننے کا اختیار موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی عورت ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اپنا فیصلہ خود نہیں کر سکتی۔ لیکن امام شافعیؒ کے مذہب کو مکمل سمجھنے کے لیے اسی آیت کا جو دوسرا پہلو ہے کہ جہاں اس سے ضمنی طور پر اختیار ثابت ہو رہا ہے، وہیں پر یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ دونوں رضامند ہیں تو تم نے اس اختیار کو استعمال نہیں کرنا۔ اس آیت کی اس صریح بات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ کا دوسرا بڑا استدلال مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح منعقد نہیں ہوتا، تو پتہ چلا کہ جب تک ولی شامل نہیں ہو گا کوئی عورت یا کوئی لڑکی لاکھ اپنا فیصلہ خود کرتی رہے وہ منعقد نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے ساتھ اسی معنی کی ایک حدیث کا ایک ٹکڑا ابھی ملانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی موقع پر ولی میں اور اس کی زیرِ ولایت عورت میں اختلاف واقع ہو جائے تو پھر جو فیصلہ ولی نے کرنا تھا وہ ولی نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کی جگہ سلطان کرے گا۔ بعض نظم اجتماعی میں اس طرح کے فیصلہ کرنے کی جس کے پاس اتھارٹی ہو وہ جج ہو سکتا ہے، وہ قاضی ہو سکتا ہے، وہ کوئی کونسل ہو سکتی ہے، کوئی اور اتھارٹی ہو سکتی ہے، وہ بادشاہ یا حاکم خود بھی ہو سکتا ہے، وہ اتھارٹی اب یہ فیصلہ کرے گی۔ گویا اب ولایت ٹرانسفر ہو گئی ہے ولی سے یعنی لڑکی کے والد یا اس کے بھائی سے اس اتھارٹی کی طرف۔ یہ بھی اسی حدیث کا حصہ ہے اور امام شافعیؒ کا جو پورا مذہب ہے اور جو ان کی اپنی عبارات سے سمجھ میں آتا ہے وہ اس پہلو کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا پورا مذہب یہ ہے اور یہ بات امام شافعیؒ اپنی کتاب الام میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے کہ ایک لڑکی اگر کسی جگہ نکاح کرنا چاہ رہی ہے، وہ قدم اٹھانا چاہ رہی ہے اور ولی اس میں رکاوٹ بن رہا تو دیکھیں گے کہ جہاں وہ لڑکی فیصلہ کرنا چاہ رہی ہے وہ اس کا کفو ہے یا نہیں ہے، اگر وہ اس کا کفو نہیں ہے پھر تو ولی کی بات مانی جائے گی اور یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہونے دیا جائے گا، اگر کر بھی لیں تب بھی ہم کہیں گے کہ وہ کالعدم ہے، لیکن اگر لڑکی کہتی ہے کہ میں نے یہاں نکاح کرنا ہے اور وہ اس کا کفو بھی ہے اور ولی کہتا ہے کہ میں نے نہیں کرنے دینا تو امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ قرآن نے کہا تھا کہ جب وہ اپنی رضامندی سے فیصلہ کر رہے ہوں تو تم نے اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے رکاوٹ نہیں بننا۔ اس کو فقہ شافعی اور دیگر فقہ کی اصطلاح میں "عضل" کہتے ہیں۔ عضل کے معنی کسی کام سے روکنے کے ہیں اور یہ اصطلاح قرآن ہی سے لی گئی ہے، تو ولی یہاں عضل کا مرتکب ہوا ہے، کیونکہ اس نے اپنے اختیار کو غلط استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ معاملہ اب سلطان یا قاضی کے پاس جائے گا یا جو بھی اتھارٹی ہو گی، اس کے پاس جائے گا۔ ولی نے چونکہ اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا اور عضل کا مرتکب ہوا، اس لیے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس عہدے اور منصب سے معزول ہو گیا۔ لہٰذا اب سلطان اس کا قائم ہو کر اس کا ولی بنے گا اور اس لڑکی کا نکاح اس جگہ پر کرا دے گا جہاں وہ کرنا چاہتی ہے۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جس جگہ لڑکی نکاح کرنا چاہ رہی ہے وہ جگہ ہے تو کفو لیکن کفو ہونے کے باوجود وہ اتنی مناسب نہیں لگ رہی اور جس جگہ ولی کہہ رہا ہے وہ جگہ دیکھنے میں بہت مناسب لگ رہی ہے۔ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک شہری زندگی گزارنے والی پڑھی لکھی عورت ہے۔ اس کا ایک کزن ہے جہاں وہ نکاح کرنا چاہتی ہے، وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے بس ٹیکنیکل طور پر برابری کر سکتا ہے اور وہ رہتا بھی گاؤں میں ہے اور دوسری طرف اس کا ولی جہاں کہہ رہا ہے، وہ لڑکا اس سے زیادہ پڑھا لکھا ہے، برسر روزگار ہے تو عمومی طور پر دیکھیں۔ اور نتائج کے اعتبار سے دیکھیں، میرٹ پر دیکھیں تو ولی کی بات میں وزن زیادہ ہے لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ کفاءت کے اندر اندر ہے اور کفو کا بنیادی تقاضا پورا ہو رہا ہے تب تک لڑکی ہی کی مانی جائے گی اور قاضی ولی کے قائم مقام ہو کر اس کا وہاں نکاح کرا دے گا جہاں وہ لڑکی چاہتی ہے۔ اب یہاں کچھ غور فرمائیں۔ امام ابو حنیفہؒ بھی یہ کہہ رہے تھے کہ لڑکی کی چلے گی اور امام شافعیؒ نے بھی اس صورت میں لڑکی کی چلا دی، تو جو بادی النظر میں لگ رہا تھا کہ امام شافعی نے لڑکی یا عورت کو جکڑ کر رکھ دیا ہے، ایسا معاملہ نہیں ہے، بلکہ امام شافعی کے مطابق بھی اس کی مرضی پوری ہو گئی۔ بس ترتیب کا تھوڑا سا فرق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ مرضی پہلے ہی پوری ہو گئی تھی، جب کہ امام

شافعی کے مذہب کے مطابق یہ مرضی عدالت یا اتھارٹی کے پاس جا کر پوری ہو گی لیکن جب تک بات کفاءت کے دائرے کے اندر رہے تب تک بہر حال لڑکی ہی کی مانی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ولایت کے معاملے میں سب سے سخت جس امام کو سمجھتے تھے یعنی امام شافعیؒ، وہ بھی لڑکی کو براہِ راست اپنی مرضی کرنے کی اجازت تو نہیں دے رہے ہیں، البتہ کورٹ کے ذریعے اس کو بھی اپنی مرضی کرنے کی اجازت دے رہے ہیں صرف کفاءت کی شرط کے ساتھ۔ کفاءت کے مسئلے پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

دیکھنے میں جو دو نقطۂ نظر ہمیں ایک دوسرے کے متضاد لگ رہے تھے، وہ ہم نے دیکھا کہ یہ تو ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ بنیادی مقاصد پر اتفاق ہے۔ انسان کو جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں، وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ اختیار ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اس میں اپنی مرضی کر سکتا ہے مثلاً میری ملکیت میں ایک پلاٹ ہے، میں اس پلاٹ کو فروخت کروں۔ ایک کروڑ کا پلاٹ دو کروڑ میں فروخت کر دوں کسی کو دھوکہ دیئے بغیر۔ ایک کروڑ کا پلاٹ صرف ایک لاکھ میں فروخت کر دوں۔ ایک کروڑ کا پلاٹ کسی کو مفت دے دوں۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ یہ مکمل صوابدیدی اختیار ہے۔ یہ ہم کر سکتے ہیں کیونکہ یہ ذاتی نوعیت کے اختیار ہیں۔ دوسرا اختیار وہ ہوتا ہے جو درحقیقت کسی کی نیابت میں ملا ہوتا ہے، یا یوں کہیں کہ کسی کی آزادی سلب کرنے کی قیمت پر ملا ہوتا ہے، ایسے اختیارات کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ ایسے اختیار کے خاص مقاصد ہوتے ہیں۔ جب تک یہ اختیار اپنے مقاصد سے جڑا رہے تو اختیار اختیار ہوتا ہے، جب یہ اپنے مقاصد سے الگ ہو جائے تو یہ اختیار، اختیار نہیں رہتا۔ مثلاً حکومت وقت کو اپنی رعایا پر کوئی حکم چلانے کا اور کوئی حکم جاری کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور رعایا کو اللہ تعالیٰ نے پابند کیا ہے کہ تم نے اولی الأمر (اتھارٹی) کی اطاعت کرنی ہے تو حاکمِ وقت کو حکم جاری کرنے کا جو اختیار حاصل ہے، یہ اختیار نیابتی اختیار ہے، یعنی انسانی مفادات کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہر فرد اپنے طور اپنے مفاد کا فیصلہ کر رہا ہوتا ہے لیکن کچھ مفادات اجتماعی نوعیت کے ہوتے ہیں جن میں افراد اپنے طور پر فیصلہ بعض اوقات نہیں کر پاتے یا ان سے اس معاملے میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس صورت میں ایک اتھارٹی ہوتی ہے جو اجتماعی مفادات کے تحفظ میں سب کی نائب ہوتی ہے اور وہ اتھارٹی فیصلہ کرتی ہے کہ یہ کام کرنا ہے یا نہیں کرنا، تو حاکم وقت کو یہ اختیار عامۃ الناس کی طرف سے ان کی نیابت میں حاصل ہوتا ہے کہ اس طرح کے اجتماعی معاملات میں وہ کوئی فیصلہ نافذ کر دیں، لہٰذا جب تک حکومتی حکم اس مقصد سے جڑا ہوا ہے یعنی وہ کسی مصلحت کے تحت یا مفادِ عامہ کے تحت کوئی حکم جاری کرتا ہے تو اس کو ماننا ضروری ہے۔ اگر کسی جگہ نقطہ نظر کا اختلاف ہو جائے یعنی کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں مفاد عامہ ہے اور کچھ کا سمجھنا ہے کہ اس میں مفاد عامہ نہیں ہے تب بھی چونکہ ایک درجے میں اس کا مفاد عامہ کے ساتھ لنک موجود ہے، اس لیے اب بھی حکومت وقت کا حکم نافذ ہو گا اور لوگ اس کو ماننے کے پابند ہیں لیکن جہاں بہت واضح ہو یا فرض کریں کسی جگہ حاکم بھی یہ مانتا ہے کہ کوئی مقصد نہیں ہے یا لوگوں کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، بس حکم جاری کرنے کے شوق میں مَیں نے یہ حکم نافذ کیا۔ فرض کریں کہ حاکم یہ حکم دے دیتا ہے کہ صبح صبح ہر کوئی اٹھ کر اپنے بیڈ سے اترتے ہی مشرق کی طرف دس قدم چلے گا۔ اب ظاہر ہے کہ اس میں کوئی مقصد پیشِ نظر نہیں ہے تو فقہاء یہ کہتے ہیں کہ حاکم کا ایسا حکم ماننے کے ہم پابند نہیں ہوں گے اور حاکم کو وہ حکم جاری کرنے کا اختیار نہیں ہو گا، اس کو فقہا یوں کہتے ہیں: تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة۔ یعنی امام کا رعایا پر جو تصرف یعنی اپنے احکام نافذ کرنے کا اختیار ہوتا ہے وہ مصلحت کے ساتھ مشروط ہے۔ جہاں اس کا مصلحت کے ساتھ لنک ہے وہاں اس کو یہ اختیار حاصل ہے اور جہاں مصلحت کے ساتھ لنک نہیں ہے، وہاں اس طرح کے حکم کو جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ تو ولی کو اپنے زیر ولایت عورت / لڑکی پر جو اختیار ہے، ہمارے ہاں بعض اوقات یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ ذاتی اختیار ہے۔ باپ سمجھتا ہے کہ یہ ذاتی اختیار اس لیے دیا گیا کہ میں اپنی من مانی کروں۔ لیکن فقہاء اس بات پر متفق ہیں اور خاص طور پر بڑے بڑے فقہاء کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ اختیار ایک خاص مقصد کے لیے دیا گیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ لڑکی کا تجربہ کم ہے، اس کا ایکسپوژر کم ہے۔ اس بات کا امکان بہت زیادہ موجود ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر جائے اور بعض اوقات وہ جذباتی بھی ہوتی ہے، کچھ دو اچھے بول کسی نے اس کے سامنے بول دیئے تو اس پر ہو سکتا ہے کہ وہ پانی ہو جائے اور جذبات میں

کوئی قدم اٹھالے، تو عورت / لڑکی ہی کے مفاد کے تحفظ کے لیے ولی کو یہ اختیار دیا گیا ہے۔

چنانچہ یہ بات امام شافعیؒ نے خود بھی لکھی ہے اور امام شافعیؒ کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے امام بیہقیؒ نے خلاصہ یہ نکالا ہے کہ وہ لڑکی کہیں اپنے آپ کو برباد نہ کر بیٹھے۔ تو اصل مقصد عورت کے مفاد کو پیش نظر رکھنا ہے۔ اگر وہ اس حد تک آگیا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری ذاتی پسند ناپسند کا معاملہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ اختیار دیا گیا تھا اس نے اس مقصد کو سمجھا نہیں۔ اس لیے امام شافعیؒ بھی اس صورت میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے اس اختیار سے معزول ہو جائے گا اور یہ اختیار ٹرانسفر ہو جائے گا سلطان یا قاضی کی طرف۔ جب کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ وہ کفو میں نکاح کر رہی ہے، اگر کفو میں نہیں تو اس پر بات ہم کفاءت کے مسئلے میں جا کر بات کریں گے۔ اب ہم یہی فرض کر کے چل رہے ہیں کہ وہ کفاءت کو پیش نظر رکھ کر سب کچھ کر رہی ہے تو جو مقصد تھا ولی کے اختیار کا، وہ حاصل ہو گیا، لہٰذا ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ نکاح ولی کی شرکت کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لیے امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ کورٹ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر ولی سمجھتا ہے کہ کفاءت کے اصول کو نظر انداز کیا گیا ہے تو ولی کورٹ میں جائے، عورت کو کورٹ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اس کا نکاح ہو گیا ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ نہیں، معاملہ چونکہ سنجیدہ ہے، اس لیے عورت کے قدم اٹھانے سے پہلے یہ عدالت میں جانا چاہیے۔ لیکن اتنی بات پر اتفاق ہے کہ یہ معاملہ لڑکی کے مفاد کا ہے، معاملہ ولی کے ذاتی اختیار کا نہیں ہے۔ یہ جو تھوڑا سا فرق آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کے مفاد کا تحفظ تو ہونا چاہیے اور ولی کو اس کا نگہبان تو ہونا چاہیے لیکن ایک فرد کی آزادی کی قیمت پر ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ امام شافعیؒ مفاد کے اس پہلو کو ذرا زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کو ریورس کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے نکاح کو نافذ قرار دینے سے پہلے یہ معاملہ کسی اتھارٹی کے پاس چلا جائے تو بہتر ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ولایت کا معاملہ محض ذاتی اختیار کا نہیں ہے بلکہ خاص مقاصد کے ساتھ منسلک ہے، اس لیے ولایت کے احکام کسی بھی فقہ سے لیں۔ جب اس کو عملاً ہم نافذ کر رہے ہوں گے تو معاملے کو ٹیکنیکل انداز میں دیکھنے کی بجائے ولایت کے مقاصد کو مد نظر رکھ کر کسی بھی متعین صورت حال پر یا کسی متعین سوسائٹی پر، کسی بھی متعین ملک میں اس کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اور مقاصد کو دیکھ کر مختلف صورتِ حال میں مختلف احکام بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ ولایت کے مسئلے کی شکلیات پر اس انداز سے اصرار کر رہے ہوتے جیسے یہ ایک امرِ تعبدی ہو۔ امرِ تعبدی کا مطلب یہ کہ مثلاً نماز کی شرط طہارت ہے، قبلہ رخ ہونا ہے اگر یہ شرط پوری ہو رہی ہے تو نماز ہے، اگر یہ شرط نہیں ہے تو نماز نہیں ہے، یہ چیز اسی انداز سے اور اسی شکل میں شریعت کو مطلوب ہے، اس حکم کی حکمت وغیرہ کو مد نظر رکھ کر ہم اس میں اپنی مرضی سے رد و بدل نہیں کر سکتے۔ ولایت کے معاملے میں بھی بعض حضرات اسی نقطہ نظر کے حامل نظر آتے ہیں اور وہ اس کو امرِ تعبدی کے انداز میں نکاح کی شرط سمجھتے ہیں۔ امر تعبدی ماننے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ولایت کا تعلق خاص مقاصد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اسی طرح یہ نکاح کی شرط ہے جس طرح طہارت اور باوضو ہونا نماز کی شرط ہے۔ لہٰذا اگر باوضو نہیں ہیں تو نماز نہیں ہو سکتی، اسی طرح ولی نہیں ہے تو نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن فقہاء کی ایک بڑی اکثریت اس معاملے کو اس انداز سے نہیں دیکھتی۔ ہم نے دیکھا کہ امام ابو حنیفہؒ اس معاملے کو کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ امام شافعیؒ اس معاملے کو کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ مالکیہ کے ہاں اس معاملے میں بڑا تنوع ہے اور بڑی لچک ہے، اس لیے کہ وہ بھی ان مقاصد کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک معروف مالکی فقیہ ہیں القرافی، ان کی ایک کتاب ہے "الفروق"۔ اس میں انہوں نے اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے چنانچہ ان کے ہاں حالات کے بدلنے سے ولایت کے احکام بھی بدل جاتے ہیں، ایک عورت ایک بہت اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، اس کا معاشرے میں ایک مقام ہے اور ایک عورت اس طرح کے کسی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔ شریفہ اور غیر شریفہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ تو دونوں پر ولایت کے احکام کے اطلاق پر مالکیہ نے فرق کیا ہے اور عام خواتین کے بارے میں کسی عورت کے اپنی مرضی سے نکاح کرنے کے بارے میں۔ بعض مالکی اقوال کے مطابق لچک رکھی گئی ہے۔ اسی طریقے سے عام روٹین میں جس عمر میں نکاح ہوتا ہے لڑکی کا، کسی لڑکی کا اس عمر میں نکاح ہو رہا ہے اور ایک لڑکی اگرچہ وہ کنواری ہے لیکن عمر رسیدہ ہو چکی ہے جسے عانسہ کہا جاتا ہے، دونوں کے بارے میں

الگ الگ انداز سے مالکیہ کے ہاں حکم لگایا گیا ہے۔ عام روٹین کے بارے میں وہی ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہو سکتا لیکن جب وہ اپنی عمر کا کچھ حصہ گزار چکی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کا اپنا تجربہ، سمجھ بوجھ اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور کا اس کا ایکسپوژر، یہ ساری چیزیں بڑھ چکی ہوں گی۔ تو اب مالکیہ کہتے ہیں کہ ولی کی اجازت کے بغیر بھی اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ کسی کو اپنا وکیل بنادے اور وہ اس کی طرف سے نکاح کر دے، ولی کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح اور بہت مثالیں ملتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ جو فقہاء کہتے ہیں کہ نکاح منعقد ہونے کے لیے ولی کی اجازت ضروری ہے ان کے ہاں یہ اس طرح کی شرط نہیں ہے جس طرح نماز میں باوضو ہونے کی شرط ہے، بلکہ اس کو وہ مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو ایک خاص مقصد کے ساتھ منسلک کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے کتنے امکانات ہیں۔ جہاں اس شرط کے بغیر انہیں اس مقصد کے حصول کے قابل ذکر امکانات نظر آرہے ہوں، وہاں وہ اس شرط کو حذف کر دیتے ہیں اور جہاں یہ نظر آرہا ہو کہ امکانات نہیں ہیں یا بہت کم ہیں تو اس مقصد کے حصول کے لیے وہاں وہ اس شرط پر اصرار کرتے ہیں۔ تو پوری بات کا حاصل یہ نکلا کہ خاص نوعیت کی صورت حال میں اگر تجربات سے یہ بات ثابت ہو رہی ہو کہ عموماً اس میں جو مقصد ہے وہ حاصل ہو رہا ہوتا ہے تو امام ابو حنیفہؒ تو پہلے ہی سے عورت کو زیادہ اختیار دے رہے ہیں، دوسرے فقہاء بھی اس کو ولی کی بات ماننے کا پابند نہیں بناتے۔

ہمارے ہاں چونکہ اکثریت فقہ حنفی پر عامل ہے، عدالتوں میں بھی اس مسئلہ پر جہاں بحث آئی ہے، زیادہ تر عدالتوں کا رجحان امام ابو حنیفہؒ کے نقطہ نظر ہی کی طرف ہے اور اس وقت فرد کی آزادی اور فرد کے اختیارات کا جو عالمی رجحان ہے، امام ابو حنیفہؒ کا نقطہ نظر اس سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں قانونی سطح پر بنیادی طور پر بظاہر امام ابو حنیفہؒ کے ہی نقطہ نظر کو اختیار کرنا چاہیے اور یہ کہنا چاہیے کہ ایسی صورت میں نکاح منعقد ہو جائے گا، البتہ ایک تو یہ ہے کہ کسی لڑکی کا اس کے والدین کے ہوتے ہوئے، خاص طور پر کسی کنواری لڑکی کا اس طرح کا قدم اٹھانا بہت بری بات ہے اور خود فقہاء حنفیہ نے بھی اس کو بے شرمی سے تعبیر سے کیا ہے۔ اس لیے اس کی روک تھام کے لیے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اور اس میں کچھ چیزیں یہاں بطور تجویز پیش کی جا رہی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کی تربیت کرنی چاہیے اور اندازِ فکر میں تبدیلی لانی چاہیے۔ ایک طرف ہمارے سامنے امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر فقہاء کی رائے ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ لڑکی کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ ولی کے بغیر اپنا نکاح کرے، وہیں ہماری کچھ مقامی روایات ہیں، وہ روایات جو والدین کو اپنے بچوں پر بے انتہا اختیارات دیتی ہیں۔ بعض اوقات ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے، یعنی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ امام شافعیؒ جیسے فقہاء اور ہماری روایات ایک ہی صفحہ پر ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے امام شافعیؒ کے مذہب کو بتفصیل سمجھا ہے، اس سے ہمیں پتہ چلا کہ اس طرح کے معاملات میں عورت کا اپنی رائے رکھنا اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا کوئی بری بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی قباحت ہے۔ ہاں اس فیصلے کی از خود تنفیذ کر دینا اور اپنے خاندان اور خاص طور پر اپنے ولی کو ساتھ نہ ملانا بری بات ہے، جب کہ ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ والدین کے ہوتے ہوئے لڑکے اور لڑکی کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ وہ اس موضوع پر سوچیں یا کوئی رائے قائم کریں۔ والدین پوچھ لیں ان سے تو ان کا احسان ہے اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ شرمندہ سے ہو کر آگے سے ہاں کر دیں یا یہ کہہ دیں کہ جیسے آپ کی مرضی ہے، ویسے کر لیں اور اس اطاعت کو لازمی سمجھتا جاتا ہے۔ اس کی بہت ساری مثالیں میرے اپنے تجربے میں بھی ہیں۔ ایک طالب علم ہمارے ہاں درس نظامی کے آخری سال میں تھے، ان کے بارے میں کسی نے مجھ سے کہا کہ یہ طالب علم فارغ التحصیل ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے رشتے کا معاملہ بھی طے ہونا ہو گا تو ہماری ہمشیرہ ہیں اور بظاہر ان کے لیے یہ رشتہ موزوں لگ رہا ہے تو آپ ان سے اگر ہماری بات کرا دیں تو شائد کوئی بات بن جائے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ رشتہ کرانے کا کام تو ہم نہیں کرتے، البتہ اس موضوع پر آپ کی اور ان کی ملاقات اور رابطہ کرا دیں گے، پھر فریقین کو ایک دوسرے پر اطمینان ہو تو فیصلہ کر لیں۔ میں نے اس طالب علم سے اس موضوع پر بات کی۔ اس نے کہا میرے والد صاحب تو دنیا سے جا چکے ہیں، البتہ میرے بھائی ہیں، میں ان سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔ جب اس کا گھر جانا ہوا تو اس زمانے میں موبائل فون وغیرہ نہیں ہوتے تھے تو وہ پوچھ کر آیا اور مجھے آکر یہ اطلاع دی کہ جب میں نے ان کے آگے یہ بات رکھی اور اپنے استاد کے حوالے سے یہ بات رکھی تو اس پر میرے بڑے بھائی بہت زیادہ ناراض ہوئے اور یہ کہا ہم تمہارے سرپرست ہیں اور تمہارے بڑے ہیں، کیا ہم مر گئے تھے، ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں یہ جرأت ہی کیسے ہوئی کہ اس موضوع پر سوچتے، یا اس موضوع پر کسی قسم کی بات کرتے، حالانکہ اس نے از خود بات نہیں کی تھی بلکہ اپنے ایک استاد کے حوالے سے کی تھی۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک رخ ہے۔ ایک اور طالب علم مشورہ کرنے کے لیے آئے کہ میرے گھر والے ایک ایسی جگہ میرا رشتہ طے کر رہے ہیں جہاں میں نہیں چاہتا تو اب میں کیا کروں؟ تو میں نے کہا کہ اپنے والدین سے بات کریں۔ اس نے کہا کہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اگر میں اس موضوع پر بات کروں گا تو فوراً میرے والد صاحب جوتا اٹھا لیں گے اور میری خیر نہیں ہو گی۔ اس لیے کو ان کہ یہ احساس ہو گا کہ "منڈا ہتھوں نکل گیا"۔ یعنی بیٹا ہمارے ہاتھوں سے گیا، یہ اپنے بارے میں خود سوچ رہا ہے۔ یہ دونوں مثالیں تو ایسے ہی ذہن میں آ گئیں۔ ورنہ اگر ہم سوسائٹی میں جا کر دیکھیں تو اس طرح کی بہت سے مثالیں ہمیں مل جائیں گی اور ہمارے معاشرے کے انداز فکر کا ہمیں کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ یہ اندازِ فکر فقہاء میں سے کسی کی رائے سے مطابقت نہیں رکھتا اور اسلام سے بالکل

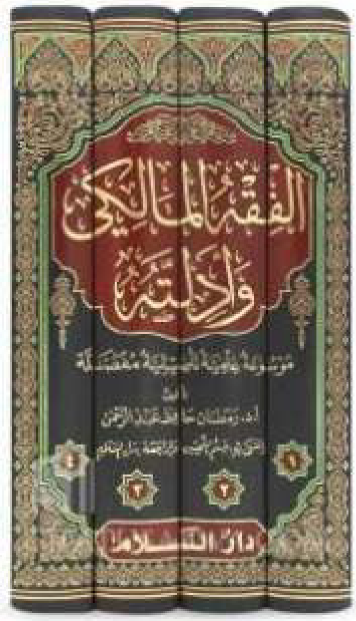

متصادم ہے۔ اسلام تو کیا اسلام آنے سے پہلے عربوں کے ہاں عورت کے اختیارات نسبتاً کم تھے لیکن اس کے باوجود ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد کے نکاح کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ مرد اور عورت یا لڑکا اور لڑکی خود کرتے ہیں، البتہ جب اس کی تنفیذ کا وقت آتا ہے تو بڑوں کو آگے کر لیا جاتا ہے اور عملی نفاذ ان کے ذریعے سے ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے ام المؤمنین سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ نکاح کا انداز بھی یہی تھا۔ یہ فیصلہ اصلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا اور حضرت خدیجہؓ کا اپنا تھا۔ ان دونوں کے درمیان معاملہ طے ہوا، جب معاملات طے ہو گئے تو انہوں نے اپنے بڑوں کو بتایا اور انہوں نے خوش ہو کر اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی طرف سے عقد کرنے والے آپؐ کے چچا ابو طالب تھے اور حضرت خدیجہؓ کی طرف سے عقد کرنے والے ان کے والد یا چچا تھے۔ تو اس طرح کے معاملے میں اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا، خواب دیکھنا، کوئی رائے قائم کرنا شرعاً کوئی قباحت نہیں رکھتا تو ہمیں اس نہج پر اپنے معاشرے کی تربیت کی ضرورت ہے کہ اپنے بچوں کو فیصلے کرنے میں اختیار دیں۔ ان کی سمجھ، بوجھ پر بھی اعتماد کریں، اعتماد کریں گے تو ہی ان کی سمجھ بوجھ بڑھے گی، جس صلاحیت کو استعمال ہی نہ کیا جائے، یا اس کو استعمال کی اجازت ہی نہ دی جائے، وہ صلاحیت کسی کام کی نہیں رہتی۔ اور اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کوئی رائے قائم کر لے تو دوسری چیز یہ ہے کہ اسے اپنی انا کا مسئلہ کبھی نہیں بنانا چاہیے۔ چاہے ان کے طریقہ کار میں غلطی ہو لیکن ایک رائے تک جب وہ پہنچ گئے ہیں تو اب وہ اس رائے کو سنجیدگی سے دیکھیں اور اس میں ماننے کی گنجائش ہو تو وہ رائے اس لیے قابل ترجیح ہے کہ وہ اس کو پسند کر رہے ہیں۔ اس لیے پسند کی شادی میں بذات خود کوئی برائی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بعض اوقات اس کو غیرت کا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور والدین اکڑ جاتے ہیں کہ اگر موزوں بھی ہے تو چونکہ پہل تم نے کی ہے۔ اس لیے یہ کام اب کسی بھی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ تیسرا، جو اس طرح کے معاملات غلط روابط اور غلط تعلقات کے نتیجے میں بنتے ہیں، ان کی روک تھام کے بھی اقدامات ہونے چاہییں اور اس کو سنجیدگی سے دیکھنا چاہیے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اگر ہم اس معاملے میں فقہ شافعی کو لیں کہ اس طرح کا اگر اختلاف ہو جائے یا سرپرست اور لڑکی میں تو فیصلہ کوئی اتھارٹی کرے گی۔ ہمارے ہاں کورٹ میرج کا بہت رواج ہے اور تکنیکی طور پر جب کورٹ میرج ہوتی ہے تو وہ فقہ شافعی کے تقاضوں کے تحت ہو رہی ہوتی ہے، خاص طور پر جب کفاءت کو بھی مد نظر رکھا گیا ہو، لیکن یہ معاملہ صرف تکنیکی انداز سے دیکھنے کا نہیں بلکہ نتائج کے اعتبار سے دیکھنے کا بھی ہے۔ عدالت کا مزاج عام طور پر چیزوں کو تکنیکی انداز سے دیکھنے کا ہوتا ہے اور ہمارے ہاں عدالتوں پر بوجھ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ س طرح کے معاملات کو وہ زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھ بھی نہیں پاتیں، اس لیے ہمارے ہاں خاندانی تنازعات کے تصفیہ کے لیے وسیع پیمانے پر فورم ہونے چاہییں اور ایک ایسا ادارہ ہو قومی یا صوبائی سطح پر جو بہت با اختیار ہو اور وہ تنازعات کے تصفیہ کے معاملے میں لوگوں کی تربیت بھی کرے۔ اس کے لیے جو مطلوبہ تعلیم ہے وہ دلائی جائے۔ یونیورسٹیز کو یہ ڈسپلن متعارف کرانے کا کہا جائے اور پھر ڈویژنل، ضلعی اور تحصیل کی سطح سے ہوتے ہوئے یونین کونسل تک ان اداروں کو پہنچایا جائے اور تقریباً ہر یونین کونسل میں تصفیہ تنازعات کا ایک ماہر موجود ہو جو ان ساری چیزوں کو سمجھتا ہو اور وہ اس کام کے لیے مخصوص بھی ہو تاکہ اس کے پاس وقت ہو۔ یہ معاملہ اس کے پاس جائے۔ عدالت پہلے ان کے پاس بھیجے اور ان کی سفارشات کے بعد اگر عدالت نے کوئی فیصلہ کرنا ہے تو کرے اور یہ ادارے صرف اسی کام کے لیے ضروری نہیں ہیں بلکہ ہمارا قانونِ طلاق اور خلع یا عدالتی فسخِ نکاح کے بارے میں ثالثی کونسل تشکیل کرتا ہے، ہمارے ہاں ثالثی کونسل کی کارروائی بالکل کاغذی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن اگر اس طرح، ادارہ جات اوپر سے لے کر نیچے تک تشکیل پا جائیں تو بہت سارے گھر ٹوٹنے سے بچ سکتے ہیں۔ بہت سارے گھر بن سکتے ہیں، کیونکہ اس طرح کے معاملے میں والدین اور بچوں کی آپس میں ضد بن جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، البتہ جب تھرڈ فورم پر معاملہ جائے گا اور وہاں تصفیہ کے ماہرین موجود ہوں گے، وہ اس مزاج کو بھی سمجھتے ہوں گے اور یہ ساری چیزیں ان کی تربیت کا حصہ ہوں گی، ان کو قائل کرنا بھی ان کی تربیت کا حصہ ہو گا تو وہ جس فریق کو قائل کرنا چاہیں وہ قائل کر سکیں گے۔ جو فریق غلط راستے پر چل رہا ہے، وہ اس کو بچا بھی سکیں گے اور ان کا معاملہ بھی حل کر سکیں گے۔ تو ہم اگر اپنے ملک میں فقہ حنفی کو بطور اصول اپنائیں تو یہ تجاویز بھی ہمارے مد نظر رہنی چاہییں۔ اب تک جو بات ہوئی، وہ ولایت کے بارے میں ہے، اس کے بعد کچھ باتیں کفاءت کے مسئلے پر کریں گے۔

سوال کے دوسرے حصے کا تعلق نکاح میں کفو کے مسئلے سے ہے۔ کفو کے معنی ہوتے ہیں کسی کے لیے برابر اور ہمسر شخص۔ نکاح میں کفو کا کتنا اعتبار ہے اور کس طرح سے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس میں فقہا کی آرا کافی مختلف ہے۔ خاص طور پر تفصیلات میں کافی اختلاف ہے۔ بعض فقہا کی رائے یہ ہے کہ نکاح میں کفاءت کا کوئی اعتبار نہیں۔ یعنی کسی بھی مرد کا کسی عورت سے نکاح ہو جائے تو نکاح صحیح بھی ہو گا، منعقد بھی ہو گا اور اس پر کسی فریق کو یا ولی کو یا متعلقہ شخص کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہو گا، سوائے اس کے کہ جہاں اسلام اور کفر کا مسئلہ ہو کہ ایک مسلمان مرد کا نکاح کس کس سے ہو سکتا ہے اور ایک مسلمان عورت کا نکاح کس سے ہو سکتا ہے اور کس سے نہیں ہو سکتا ہے۔ معتبر نہیں ہے۔

ان کا بنیادی استدلال تو ان آیات اور احادیث سے ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ انسانوں میں برابری کا اصول ہے اور انسانوں میں ایک دوسرے پر برتری کا واحد معیار تقویٰ اور انسان کا ایمان اور کردار ہے۔ باقی جتنی چیزیں کفاءت میں ذکر کی جاتی ہیں وہ کسی انسان کے دوسرے انسان سے برتر ہونے یا برابر ہونے یا نہ ہونے

کے معاملے میں غیر متعلق ہیں۔ لہٰذا نکاح میں بھی ان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ عہدِ رسالت کے بعض واقعات ان کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ابو داؤد میں ہے کہ بنو بیاضہ قبیلے کے ایک غلام تھے، ابو طیبہ ان کا نام تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حجامہ بھی کیا تھا، یعنی خاص طریقہ سے خون نکال کر علاج کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اپنی بچی کا نکاح ابو طیبہ سے کرا دیا جائے، یہ اس قابل ہیں کہ ان کو رشتہ دیا جائے۔ امام ابو داؤد ہی نے سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ ابو طیبہ سے اپنی فلاں عورت کا اور فلاں لڑکی کا نکاح کرا دو، تو اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ کیا ہم اپنی بیٹیوں کا نکاح اپنے مولا سے یعنی آزاد کردہ غلام سے کروائیں۔ تو زہری کی اس روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت اتاری کہ ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت یعنی آدمؑ اور حواؑ سے پیدا کیا ہے۔ تمہارے جو قبائل وغیرہ ہیں، یہ صرف تعارف کے لیے ہیں۔ فضیلت اور مرتبہ کے لیے نہیں ہیں۔ فضیلت اور مرتبہ کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ اس طرح کی روایتوں میں سند کے اعتبار سے کلام کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن بہر حال پہلی روایت کے ساتھ مل کر دونوں ایک دلیل کسی حد تک ضرور بناتی ہیں۔

ابو داؤد ہی کی المراسیل میں ایک اور روایت ہے اور اس مضمون کی روایتیں اور بھی بعض حضرات نے ذکر کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ جو کہ ایک آزاد کردہ غلام تھے، حبشی تھے اور اس وقت کے رسم و رواج کے اعتبار سے ان کا سماجی مقام اور مرتبہ تھا، وہ ظاہر ہے کہ ان کا خاندانی لوگوں کے برابر نہیں سمجھا جاتا تھا اور انصار کے ایک گھرانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش کی کہ بلال کو رشتہ دے دیا جائے، تو اس سے بھی وہ حضرات ثابت کرتے ہیں کہ کم از کم نسب اور اس طرح کی چیزوں میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہے۔ اس کی ایک مضبوط اور ٹھوس دلیل جو سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے کیونکہ اب تک جو روایتیں ہم نے ذکر کی ہیں، ان کی سندوں پر کلام ہو سکتا ہے۔ وہ ہے کہ قریش کی ایک بڑی ہی خاندانی عورت تھیں، فاطمہ بنت قیسؓ ان کو طلاق ہو گئی تھی۔ عدت کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا تھا کہ عدت مکمل ہونے کے بعد جو رشتے تمہارے پاس آئیں تم مجھ سے مشورہ ضرور کر لینا، چنانچہ دو رشتے آئے اور دونوں ہی قریش کے خاندانی لوگ شمار ہوتے تھے۔ اُن میں سے ایک ابو جہم تھے اور دوسرے حضرت معاویہ بن ابی سفیان تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض وجوہات کی بنیاد پر دونوں کے بارے میں مشورہ دیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے اور ان کی بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے نکاح کرنے کا مشورہ دیا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد کردہ غلام کے بیٹے تھے، یعنی اپنے سماجی مقام اور مرتبے کے اعتبار سے ایک مولا تھے جو کہ عربوں کے تصور کے مطابق کمتر مرتبہ سمجھا جاتا تھا اور دوسری طرف قریش کی ایک خاندانی خاتون تھیں، ان دونوں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا مشورہ دیا۔ اس سے ان حضرات نے یہ ثابت کیا ہے کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار نہیں ہے لیکن دوسری طرف فقہاء کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو کہ کہتی ہے کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار ہے۔

اگرچہ اس کی تفصیلات میں ان فقہا کا آپس میں اختلاف ہے وہ بھی اپنے استدلال میں بعض روایات پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک ایک کو دیکھا جائے تو وہ تمام روایات سند کے اعتبار سے صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، لیکن ان سب کو اگر ملا کر دیکھا جائے تو بہر حال وہ دلیل بنتی ہیں۔ اُن میں سب سے معروف روایت ترمذی کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو مؤخر نہیں کرنا چاہیے۔ نماز، جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جب کہ وہ تیار ہو جائے تو جلدی نماز جنازہ پڑھ کر اس کو اپنی آخری منزل تک پہنچانا چاہیے اور تیسرے نمبر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کا جب اس سے کفاءت رکھنے والا رشتہ مل جائے تو اس کی شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی لڑکی یا کسی عورت کی شادی میں تاخیر کا ایک عذر یہ ہو سکتا ہے کہ رشتہ مل رہا ہے لیکن کفاءت والا نہیں مل رہا تو اس سے ثابت ہوا کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو دونوں طرف کی روایات میں ہمیں کوئی تعارض نظر نہیں آئے گا۔ خاص طور پر اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ جو فقہاء کفاءت کے قائل ہیں، وہ کیوں قائل ہیں اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اصل میں کفاءت بذاتِ خود نکاح کے اندر اس طریقے سے کوئی مقصودی چیز نہیں ہے جس طریقے سے مثلاً مہر ہے، یہ نکاح کا اہم حصہ اور مقصودی جُز ہے۔ کفاءت درحقیقت نکاح کے معاملے میں ایک اضافی امر ہے اور ایک خاص وجہ سے اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اگر وہ وجہ پائی جائے تو اس کا اعتبار ہو گا اگر وجہ نہ پائی جائے اس کا اعتبار نہیں ہو گا۔ اس بات کی اہم دلیل یہ ہے کہ ابنِ رشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں ولی کے عورت پر اختیار کے بارے میں ایک اہم بات کہی ہے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ فقہ حنفی میں خاص طور پر امام ابو حنیفہؒ کے ہاں ولی کو عورت پر اختیار بہت محدود سا دیا گیا ہے۔ ابن رشدؒ امام ابو حنیفہؒ کی تائید میں فرماتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ولی کے درجات اور مراتب بیان نہیں کیے گئے کہ ولی کون ہو گا اور اس کے بعد کون ہو گا، اس سے معلوم ہوا کہ ولی کے اختیارات کسی دوسری وجہ سے ہیں۔ یہ نکاح میں بذات خود مقصودی چیز نہیں ہے۔ درحقیقت نکاح کے جو مقاصد ہیں وہ یہ ہیں کہ دونوں میں محبت ہو اور دونوں پر سکون زندگی گزار سکیں۔ تو یہی بات کفاءت کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ کون کس کا کفو ہے اس کی تفصیل شریعت نے بیان نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفاءت بذاتِ خود مقصود نہیں بلکہ جہاں اس کا اعتبار کیا گیا ہے وہ کسی اور مقصد کے لیے کیا گیا ہے۔

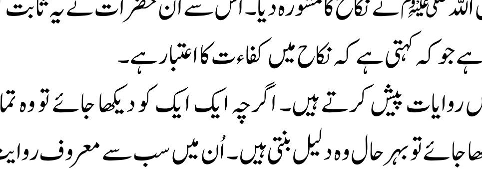

کفاءت کا اعتبار درحقیقت اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ شریعت کا ایک اصول ہے کہ دو عقد کرنے والے شخصوں کو اپنی مرضی سے عقد کرنے کا اختیار ہوتا ہے بشرطیکہ ان کے عقد کے ذریعے کسی تیسرے فریق کو نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہ ہو، یعنی کسی تیسرے فریق کی حق تلفی نہ ہو۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ میرے

پاس کوئی چیز ہے، میں کسی دوسرے کو بیچنا چاہوں تو جس قیمت پر جب چاہوں بیچ سکتا ہوں، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے شفعہ بھی متعارف کرایا ہے، کیونکہ بعض اوقات میں اپنا مکان یا زرعی زمین کسی اور شخص کو فروخت کرتا ہوں تو ممکن ہے اس کے مالک بننے سے اس جگہ کے پڑوسی کو کوئی نقصان پہنچے، اس کی حق تلفی ہو، یا اس کے لیے کوئی مسئلہ بنے یا اسی طریقے سے کسی زمین میں میری کوئی ملکیت ہے اور دوسرا شخص بھی اس میں برابر کا شریک ہے یا خاص تناسب سے شریک ہے تو میں اپنا حصہ اگر بیچ رہا ہوں تو پہلے اس کا شریک میں تھا، اب میری جگہ پر اس کا شریک کوئی اور بنے گا تو ہو سکتا ہے کہ مجھے بطور شریک وہ گوارہ کرنے کے لیے تیار ہو، کسی اور شخص کو، جس کو میں اپنا حصہ فروخت کر رہا ہوں، بطور شریک تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ وہ اس کو اپنے لیے مشکلات کا باعث سمجھے۔ تو اس ضرر کے ازالے کے لیے میرے بیچنے کے حق پر شریعت شفعہ کا ایک بند لگا دیا۔ یہ اسلام کا اصول ہے جس کو حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے لا ضرر ولا ضرار یعنی کوئی ایسا کام نہیں کیا جائے گا جس سے کسی کو ضرر پہنچے اور نہ ہی کسی ایسے تصرف اور ایسے معاملے کو برداشت کیا جائے گا۔ کفاءت کا تعلق در حقیقت کسی امر مطلوب کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق امرِ واقع کے ساتھ ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ایک خاندان پر یا حسب و نسب پر فخر کرنا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ مال و دولت پر فخر کرنا کوئی پسندیدہ بات نہیں۔ کسی کو کسی پیشہ کی بنیاد پر حقیر اور کمتر سمجھنا، کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے لیکن آپ جتنی مرضی تقریر کر لیں، امر واقع، اکثر و بیشتر معاشروں میں یہی ہوتا ہے کہ اس طرح کی بہت ساری چیزوں کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں فرق کیا جاتا ہے۔ ایک برادری اپنی ہی برادری یا برابر کی برادری کے لوگوں کے ساتھ اور برتاؤ کرتی ہے، بعض اوقات کم تر برادری سے اور نوعیت کا برتاؤ کرتی ہے۔ ایک پیشے کا آدمی ہمارے پاس آجائے تو ہم اس کو اور طرح کی عزت دیتے ہیں اور اگر کسی اور پیشے کا آدمی ہمارے پاس آجائے، مثلاً جوتے بنانے والا یا ہاتھ سے کپڑے بُننے والا، تو ہم بعض اوقات اس سے اور طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ سماج میں یہ چیزیں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہیں، بطور امرِ واقع ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نکاح کے معاملے میں اسلام نے صرف مثالی صورت حال کو مدِ نظر نہیں رکھا بلکہ عملیت پسندی کا بھی ایک حد تک ثبوت دیا ہے۔

جب امرِ واقع میں لوگ اس طرح کے فرق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاتون کا نکاح کسی خاص جگہ پر ہونے کی صورت میں وہ رشتہ بعض اوقات اس خاتون کے لیے عار کا باعث بن جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھیں یہ عورت کس طرح مرد کے نکاح میں چلی گئی۔ بعض اوقات اس عورت کے خاندان کے لیے یہ چیز باعثِ عار بن جاتی ہے کہ یہ جوتے گانٹھنے والے کے ہاں چلی گئی۔ اسلام کی نظر میں جوتا گانٹھنے والا اگر متقی و پرہیز گار ہے تو کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ بہر حال لوگ تو کہتے ہیں اور لوگوں کے کہنے کی وجہ سے جو اس لڑکی کے خاندان کو تکلیف پہنچے گی، وہ بہر حال پہنچنی ہی پہنچنی ہے، اس کا تعلق امرِ مطلوب سے نہیں ہے، اس کا تعلق امرِ واقع سے ہے، تو گویا کفاءت کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں بعض اوقات کسی فریق کو ضرر لاحق ہو رہا ہوتا ہے عار کا، تو عار کے ضرر کو دور کرنے کے لیے فقہاء نے کفاءت کا اعتبار کیا ہے۔ تو ہم نے اب تک جو جو دو قسم کی نصوص پیش کی ہیں، بعض سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے معاملے میں کفاءت کا کوئی اعتبار نہیں کیا اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو مد نظر رکھا ہے تو دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ جہاں اس کو نظر انداز کیا گیا ہے وہاں اس وجہ سے کہ پتہ تھا کہ کوئی شخص اس میں عار محسوس نہیں کرے گا، یا ماحول ایسا ہے کہ کسی کو کوئی عار محسوس نہیں ہو گا، لہٰذا یہاں ضرر لاحق نہیں ہو رہا یا متعلقہ فریق اس کو نظر انداز کرنے کو تیار ہیں کہ لوگ کہتے ہیں تو کہتے رہیں ہمیں کیا؟ لہذا جہاں کفاءت کو نظر انداز کیا گیا ہے کہ پتہ تھا وہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کوئی امرِ مطلوب نہیں کہ جس کی اسلام دعوت دیتا ہو کہ اس بات کا اہتمام کرو کہ فلاں اعلیٰ برادری کی خاتون کا نکاح کسی جوتے گانٹھنے والے سے نہ ہو۔ اس معنی میں کفاءت مطلوب نہیں ہے۔ اور جہاں کفاءت کا اعتبار کیا گیا ہے مثلاً حضرت علیؓ کی روایت میں ہے کہ کفو نہ ملنے کو نکاح میں تاخیر کا ایک جواز بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہاں کفو کو بطور امرِ واقع کے تسلیم کرنا ہے کہ چونکہ اس چیز کو نظر انداز کر کے تمہارے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ تم لوگوں کی باتیں سن سکو اور لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر سکو اس لیے اگر کفو اور برابر کے رشتے کی تلاش میں تاخیر کر رہے ہو تو یہ بھی تاخیر کی ایک معقول وجہ اور عذر بن سکتا ہے۔

اب تک کی ساری گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار کرنا فقہاء کی ایک بڑی اکثریت کا مذہب ہے، لیکن یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلام ایک نئی

چیز کو متعارف کرانا چاہتا تھا بلکہ یہ عرب معاشرے میں اور اس دور کے بیشتر معاشروں میں پہلے سے بطور امر واقع کے یہ چیز موجود تھی اور اس وقت امر واقع کی وجہ سے کسی فریق کو عار کا جو ضرر لاحق ہو سکتا تھا اس سے تحفظ کے لیے کفاءت کا اعتبار کیا گیا۔ آج اگر ہم کفاءت کے اصول کو لاگو کرنا چاہیں تو کیسے کریں گے۔ اس میں ہم یہ دیکھیں گے کہ اگر کوئی معاشرہ ایسا ہے جہاں یہ ساری چیزیں نظر انداز ہو چکی ہوں، بہت سارے مغربی معاشرے ایسے ہیں کہ جہاں نکاح دو انسانوں کا آپس کا معاملہ ہے، کوئی انگلی نہیں اٹھاتا کہ فلاں نے فلاں سے کیوں شادی کر لی؟ انتہائی خوبصورت خاتون اور سفید رنگت کی خاتون بعض اوقات انتہائی کالے شخص سے شادی کر رہی ہوتی ہے جن میں بعض اوقات پیشے کے مطابق بھی کوئی نسبت نہیں ہوتی، مالی حیثیت کے اعتبار سے بھی کوئی نسبت نہیں ہوتی، لیکن اس ماحول میں کسی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنتا۔ تو جہاں کفاءت نظر انداز کرنا کسی سماج کا حصہ بن چکا ہو، وہاں اس کو متعارف کرانے کی کوشش کرنا اسلام کا حکم نہیں ہے، وہاں تو بہتر ہے کہ اسی انداز سے چلا جائے۔ اگر کسی معاشرے میں اس طرح کوئی صورت حال بڑھ رہی ہو یعنی آہستہ آہستہ کفاءت میں جن چیزوں کا اعتبار کیا جاتا ہے، ان کو نظر انداز کرنے کا ماحول بڑھ رہا ہو تو وہاں قانون سازی کے ذریعہ کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ بات کو ادھر بڑھنے دینا چاہیے۔ لیکن بہر حال ہمارے بیشتر سماج ایسے ہیں، جہاں وہ عملی صورت حال موجود ہے جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں تھی جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اور اس کے نتیجہ میں عار کا مسئلہ بن جاتا ہے، لہٰذا اس کا تعلق امر عرفی سے ہے۔

اب ہم کفاءت کے دوسرے پہلو کی طرف آ رہے ہیں کہ کفاءت کن کن چیزوں میں معتبر ہے۔ دین میں سب مانتے ہیں کہ معتبر ہے اور دین کی اہمیت تو بالکل احادیث سے ثابت ہے، لیکن ہم دین کو نظر انداز کر کے باقی چیزوں میں کفاءت کو دیکھیں مثلاً حسب و نسب میں معتبر ہو گی یا نہیں ہو گی۔ مالی حیثیت میں کفاءت معتبر ہو گی یا نہیں ہو گی؟ پیشے میں کفاءت ہو گی کہ نہیں ہو گی۔ اس طرح کی بہت ساری چیزوں میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، تو کفاءت کا جو بنیادی تصور ہے وہ چونکہ عُرف کی وجہ سے اور معاشرتی رسم و رواج کی وجہ سے آیا ہے، شریعت کے کسی امر مطلوب کی وجہ سے نہیں آیا، لہٰذا کن چیزوں میں کفاءت کا اعتبار کرنا اور کن چیزوں میں نہیں کرنا؟ اس کو بھی ہر زمانے اور ہر علاقے کے عرف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آج ہم اگر اس اصول کو اپنانا چاہیں تو ہمیں اس حوالے سے مناسب قانون سازی کرنی چاہیے اور جن جن چیزوں پر لوگ ابھی بہت مضبوط ہیں اور نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، صرف ان چیزوں کو کفاءت میں لینا چاہیے۔ آج کے دور میں کفاءت کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہیے۔

دوسرے کفاءت کو امر مطلوب کی بجائے اور حق اللہ قرار دینے کی بجائے فقہاء نے حق العبد قرار دیا ہے یعنی بعض اوقات یہ لڑکی کا حق ہوتا ہے اس کے باپ نے کسی ہلکی جگہ پر اس کی شادی کرا دی تو اس لڑکی کے لیے وہ باعث عار ہے، یا ولی کا حق ہوتا ہے کہ لڑکی نے اپنی مرضی سے کسی جگہ ہلکی شادی کر لی اس لیے اس کے ولی اور خاندان کے لیے وہ باعث عار ہے تو عام طور پر جہاں کفاءت کا مسئلہ آتا ہے وہاں ایک تنازعہ بھی پیدا ہوتا ہے اور میں پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ خاندانی تنازعات کے حل کے لیے ہمارے ہاں پورا ایک System ہونا چاہیے اور میری رائے میں کفاءت کے مسئلے کو بھی اسی کے حوالے کرنا چاہیے اور اس کی رائے آنے کے بعد یا اس کا کوئی فیصلہ آنے کے بعد قانون کی روشنی میں عدالت کو کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ ولایت اور کفاءت کے مسئلے میں فقہا نے عار والے پہلو کو اہمیت دی ہے۔ اس کے علاوہ اس معاملے ایک پہلو اور بھی ہے، وہ یہ کہ ایک لڑکی اپنا نکاح خود کر لیتی ہے، والدین سمجھ رہے ہیں یہ رشتہ نبھنے والا نہیں ہے، لیکن بہر حال وہ اپنی مرضی پوری کر لیتی ہے، بعد میں والدین کی بات درست ثابت ہوتی ہے اور نباہ نہیں ہو پاتا تو کیا اس کے نتائج وہ لڑکی اکیلے بھگتے گی یا والدین کو بھی بھگتنا ہوں گے، ظاہر ہے کہ والدین کے لیے اس معاملے سے لاتعلق رہنا مشکل ہو گا۔ تو مستقبل کے امکانات کا پہلو بھی ایسا ہے کہ وہ خاندان کو بھی کسی قدر سٹیک ہولڈر بناتا ہے۔ ہمارے حالات کے لحاظ سے مفکرین اور فقہا کو اس پر غور کر لینا چاہیے کہ کیا اس پہلو کو کسی طریقے سے ولایت اور کفاءت کے مسئلے میں سمویا جا سکتا ہے یا اس مسئلے کے لیے الگ حل کی ضرورت ہے، مثلاً طلاق یافتہ عورتوں کی مشکلات کے لیے اگر کسی وقت کوئی تلاش کیے جائیں تو یہ پہلو بھی اس ضمن میں لایا جا سکتا ہے۔

۳۔ نکاح سے قبل طبی معائنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا ایسی قانون سازی کی حمایت کی جا سکتی ہے جس میں نکاح کو طبی معائنے کے ساتھ مشروط کیا گیا ہو؟

آج کل ایک نیا تصور متعارف ہوا ہے کہ شادی سے پہلے بعض میڈیکل ٹیسٹ کروانے کا کہا جاتا ہے۔ ان ٹیسٹوں کا تعلق بعض متعدی بیماریوں کا ساتھ بھی ہوتا ہے اور آنے والی نسل کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً بعض متعدی بیماریاں جنسی تعلق کے ذریعے پھیلتی ہیں جیسے ایڈز ہے یا اسی طرح کی اور کئی بیماریاں ہیں جو جنسی تعلق کے ذریعے پھیلتی ہیں تو اگر پہلے سے پتہ ہو کہ فلاں شخص فلاں مرض میں مبتلا ہے تو دوسرا فریق اس سے نکاح کرنے سے گریز کر کے اپنے آپ کو ممکنہ بیماری سے بچا سکتا ہے۔ بعض ٹیسٹ ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق آنے والی نسل سے ہوتا ہے مثلاً تھیلیسیمیا کی بیماری ہے، یہ خون کی ایک بڑی خطرناک بیماری ہے۔ اس کا اگر پہلے سے ٹیسٹ کر لیا جائے اور پہلے سے پتہ ہو اور طبی طور پر معلوم ہو کہ فلاں اور فلاں کے درمیان اگر نکاح کرا دیا جائے تو اگلی نسل میں تھیلیسیمیا پیدا ہونے کے امکانات کم ہیں اور فلاں اور فلاں نوعیت کا خون رکھنے والے لوگوں میں تھیلیسیمیا کے امکانات زیادہ ہیں تو دوسری قسم کے لوگوں کو آپس میں نکاح کرنے

سے روک دیا جائے یا خود ہی وہ ایک دوسرے سے نکاح کرنے سے گریز کریں۔

اسلام میں اس طرح کے ٹیسٹ کا حکم کیا ہے؟ شادی چونکہ زندگی بھر کا ایک عقد ہے، ہم چھوٹے چھوٹے معاملات بھی جب کرتے ہیں تو دیکھ بھال کر کرتے ہیں، ہم نے کوئی چیز خریدنی ہوتی ہے تو دیکھ بھال کر خریدتے ہیں۔ اسلام اس چیز سے منع نہیں کرتا کہ آپ کسی کے ساتھ عقد نکاح کرنا چاہتے ہیں تو اس کے بارے میں مکمل اطمینان حاصل کریں کہ آپ کے لیے یا آپ کی نسل کے لیے کسی مشکل کا باعث تو نہیں بنے گا۔

اسلام نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شادی کرنے سے پہلے لڑکے کو چاہیے کہ وہ لڑکی یا عورت کو ایک دفعہ دیکھ لے اور یہی مسئلہ دوسری طرف بھی ہے کہ اگر لڑکی / عورت نے اپنے بننے والے خاوند کو نہیں دیکھا ہوا تو وہ اسے دیکھ لے یا اس کی تصویر دیکھ لے۔ اس کی صرف اجازت ہی نہیں دی گئی بلکہ بعض احادیث کے مطابق یا بعض فقہاء کی نظر میں بعض حدیثوں کی تشریح کے مطابق اس کو ایک پسندیدہ عمل کہا گیا ہے اور اس کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کے نتیجے میں باہمی الفت اور مودّت زیادہ ہوگی کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو پہلے ہی پتہ چل جائے۔ ایسا نہ ہو کہ نکاح کرنے کے بعد کوئی چیز سامنے آئے اور طبیعت میں بوجھ کا باعث بنے اور وہ زندگی بھر کے لیے ایک پیچیدگی بن جائے تو منگیتر کو دیکھنے کا تعلق ظاہری حسن وجمال کے ساتھ ہے۔

حسن وجمال ایک امر مطلوب ہے لیکن ظاہر ہے کہ صحت کا معاملہ حسن وجمال سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس لیے بادی النظر میں یہ لگتا ہے کہ اگر صحت کے کسی مسئلے کی دریافت کے لیے کوئی ٹیسٹ کروایا جاتا ہے تو منگیتر کو دیکھنے پر قیاس کرتے ہوئے اس کا جواز ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ نکاح کے معاملے میں فقہاء نے "عیوب" کی بھی بحث کی ہے کہ مرد اور عورت میں فلاں فلاں عیب نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر اس طرح کا کوئی عیب پایا جائے تو دوسرے فریق کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ عدالت کے ذریعے سے نکاح ختم کرے تو بعد میں جس بنیاد پر عدالت کے ذریعے نکاح ختم کرانے کی گنجائش دی جاتی ہے، اگر انہیں عیوب کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ پہلے کر لیا جائے تو اس میں بھی بظاہر کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ درحقیقت میڈیکل ٹیسٹ کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نکاح سے پہلے فریقین میں سے ایک، دوسرے کے بارے میں کہتا ہے کہ مثلاً اس سے ایڈز کے ٹیسٹ کروا لیے جائے یا وہ تھیلیسیمیا کے بارے میں کہتا ہے یا کسی مرد کے بارے میں یہ شبہ ہے کہ کہیں وہ مردانہ بانجھ پن میں مبتلا نہ ہو تو لڑکی والے کہتے ہیں کہ پہلے اس کا ٹیسٹ کروا لیا جائے، اسی طرح سے بانجھ پن

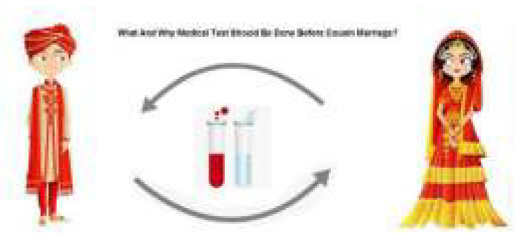

ہی کے حوالے سے لڑکے والے چاہتے ہیں کہ لڑکی کا کوئی ٹیسٹ کروا لیا جائے۔ یہ ٹیسٹ اگر ہوگا تو ظاہر ہے باہمی رضامندی سے ہوگا۔ ایک فریق نے مطالبہ کیا ہے، دوسرا رشتے کی بات کو آگے بڑھانا چاہتا ہے تو ٹیسٹ کروا لے گا اور اگر نہیں بڑھانا چاہتا تو نہیں کروائے گا۔ اس میں چونکہ ایک فریق کا دوسرے فریق پر کوئی جبر نہیں ہوتا بلکہ جو فریق ٹیسٹ کروا رہا ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں دوسرے فریق کو مطمئن کرے اور اس کے پاس یہ اختیار موجود ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو رشتے کی بات وہیں پر ختم کر دے۔ اس لیے اس طرح کے ٹیسٹ میں تو کوئی اشکال نہیں ہے اور اس کے بارے میں میرے علم کے مطابق فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف بھی موجود نہیں ہے۔ مسئلہ اس وقت بنتا ہے جب یہ تجویز دی جاتی ہے کہ ریاست کی طرف سے بذریعہ قانون بعض ٹیسٹوں کا لوگوں کو پابند کر دیا جائے، تو کیا اس طرح کی قانون سازی درست ہے یا نہیں۔ چونکہ اس طرح کی قانون سازی میں کچھ فوائد بھی ہیں اور بعض ممکنہ نقصانات بھی ہیں، اس لیے معاصر فقہاء کی آرا اس میں مختلف ہیں۔ فوائد مثلاً یہ ہیں کہ وہ سنگین بیماریاں جو بعد میں لوگوں کو لاحق ہوتی ہیں، ان کا پہلے سے پتہ چل جائے گا اور لوگ بہت ساری بیماریوں سے بچ جائیں گے۔ آنے والی نسل بہت ساری بیماریوں سے بچ جائے گی اور اس کے نتیجے میں صحت عامہ کی سہولیات پر جو بوجھ پڑ سکتا ہے اس میں کمی واقع ہو جائے گی اور جو طبی سہولیات پر بوجھ میں کمی ہو گی تو عام لوگوں کو اس سے بہتر استفادہ کے مواقع ملیں گے۔ جو وسائل ہمارے ان بیماریوں پر خرچ ہونے ہیں جو شادی سے پہلے میڈیکل ٹیسٹ کے ذریعے ہم ان سے بچ سکتے ہیں، وہی وسائل دوسری بیماریوں پر خرچ ہو جائیں گے۔ لیکن ان فوائد کے ساتھ ساتھ بعض مسائل بھی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کا ایک چھپا ہوا عیب ہے، ٹیسٹ کے نتیجہ میں وہ عیب سامنے آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بیماری کو چھپانا ہی چاہتا ہے تو وہ تو اس کا بظاہر ایک حق بنتا ہے۔ اسی طریقے سے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کے اندر کسی بیماری کا جرثومہ موجود ہو لیکن بعض صورتوں میں وہ جرثومہ ایکٹیو نہیں ہوتا، وہ اگلی نسل کے لیے تو خطرے کا باعث بن سکتا ہے لیکن اس کے لیے خطرے کا باعث نہیں، یہ صرف اس کا حامل (carrier) ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں جب اس کو پتہ چلے گا کہ میرے اندر یہ جرثومہ بیماری کا موجود ہے جس نے اس کو کوئی نقصان نہیں دینا تھا، وہ نفسیاتی طور پر بعض پیچیدگیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے تو اس لیے اس میں بعض نقصان کے پہلو بھی ہیں۔ اس لیے معاصر علماء کی اس میں دونوں آرا موجود ہیں۔ بعض حضرات کی رائے ان نقصانات کو دیکھتے ہوئے یہ ہے کہ حکومت یا قانون کو اس معاملے میں جبر کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کو فریقین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے، حکومت زیادہ سے زیادہ لوگوں میں آگاہی پیدا کرنے اور ترغیب دینے کی کوشش کرے۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ اس میں مفاد عامہ کا تحفظ ہے اور مفاد عامہ کے تحفظ کے لیے جائز امور میں قانون سازی کا حکومت کو یا ریاست کو اختیار حاصل ہوتا ہے، اس لیے اس طرح کی اگر کوئی پابندی لگا دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیماریاں جو شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہیں، ان کے بارے میں تو اس طرح کی قانون سازی نہیں ہونی چاہیے لیکن جن بیماریوں کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، یا اگلی نسل میں بیمار بچے پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ وہاں اگر کوئی حکومت اس طرح کی پابندی لگانا چاہے تو اس کی گنجائش ہونی

چاہیے۔ بہر حال دونوں آرا موجود ہیں اور اس بات پر فقہاء کے درمیان اتفاق ہے کہ جس معاملے میں فقہی طور پر آرا مختلف ہوں، وہاں اگر مسلمان حکومت کوئی قانون بنا دے تو اس قانون پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور وہ ہر ایک کے لیے ضروری ہو گا، چاہے ذاتی طور پر کسی کی پہلی رائے ہو یا دوسری رائے ہو۔ اسی طرح کسی غیر مسلم ملک میں ہم رہ رہے ہیں تو چونکہ ہمارا ان کے ساتھ قانون کی پابندی کا ایک عہد ہوتا ہے، اس لیے کسی غیر مسلم ملک میں بھی اگر اس طرح کا قانون موجود ہو تو عملاً اس کی پابندی ایک مسلمان کو بھی کرنی چاہیے۔

۴۔ قریبی رشتہ داروں میں شادی کے حوالے سے طبی ماہرین کی طرف سے خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے جن میں بڑا خدشہ موروثی بیماریوں کا پھیلاؤ ہے۔ موروثی بیماری کے پھیلاؤ کے حوالے سے شریعت کے کیا احکامات ہیں؟

قریبی رشتہ داروں میں کچھ رشتے تو ایسے ہیں جن کو خود اسلام نے حرام قرار دیا ہے جن میں والدین ہیں، بہن بھائی ہیں اور والدین کے بہن بھائی ہیں، جیسے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ وغیرہ۔ ان سے نکاح کرنا تو جائز نہیں ہے۔ ان کے علاوہ باقی جتنے رشتے دار ہیں ان سے نکاح کی شریعت میں اجازت ہے۔ البتہ قریبی رشتہ داروں میں نکاح کے حوالے سے فقہائے شافعیہ اور فقہائے حنابلہ نے نکاح کے مستحبات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں میں نکاح کرنے کی بجائے رشتہ ذرا دور سے ڈھونڈا جائے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث بھی بعض حضرات نے ذکر کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منسوب ہے کہ دور کا رشتہ حاصل کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اولاد کمزور نہیں ہو گی، صحت مند ہو گی۔ لیکن محدثین کے ہاں یہ حدیث ثابت نہیں ہے، اس لیے ان الفاظ کی

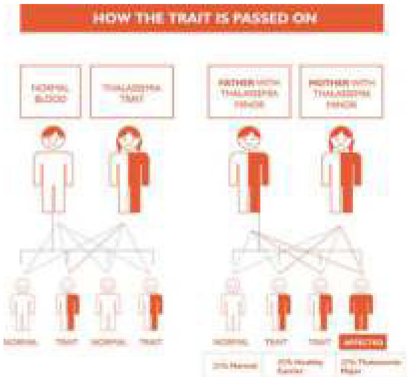

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف نسبت کرنا درست نہیں ہے، البتہ جس کثرت سے یہ فقہائے حنفیہ، حنابلہ اور عربی ادب کی کتب میں لکھا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کا ایک کلمہ حکمت ضرور تھا، یعنی عربوں کے تجربات کا یہ نتیجہ ضرور تھا کہ دور کا رشتہ حاصل کرنا اولاد میں بہتری کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے امام شافعیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ جہاں جس خاندان کی عورتیں مسلسل اپنے ہی خاندان میں بیاہی جائیں اور دوسرے خاندانوں میں نہ جائیں تو وہاں بچوں میں ذہنی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، جو میں نے اوپر حدیث کا ذکر کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف نسبت کے حوالے سے تو ثابت نہیں ہے، البتہ بعض نے اس طرح کی بات حضرت عمرؓ کی طرف ضرور منسوب کی ہے کہ بنو سائب ایک خاندان تھا جن میں بچے کمزور پیدا ہونے لگ گئے تھے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ تمہاری نسل چونکہ کمزور ہو رہی ہے، اس لیے دور کی عورتیں لے کر آؤ یعنی دوسرے قبائل میں رشتے کرو تا کہ تمہارا یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ اس سے دو باتیں ہمیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ عربوں کے تجربات میں پہلے سے یہ بات شامل تھی کہ بہت زیادہ قریبی رشتہ داروں میں نکاح کرنے سے بچوں میں مسائل پیدا ہوتے ہیں دوسرا چونکہ بہتر اولاد مقاصد نکاح میں سے ہے، اس لیے شافعی اور حنبلی فقہا نے اس چیز کو، کہ دور کے خاندان میں رشتہ کیا جائے، نکاح کے مستحبات میں سے قرار دیا ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو قریبی رشتوں کو ہم تین حصوں میں تفہیم کرتے ہیں۔ ایک تو وہ بہت انتہائی قریبی رشتے ہیں جن کو اسلام نے ویسے ہی حرام اور ممنوع قرار دے دیا ہے۔ طبی طور پر مسائل پیدا ہونے کے امکانات بھی ان میں زیادہ تھے جن سے اسلام نے منع کر دیا ہے، والدین ہیں، بہن، بھائیوں کا رشتہ ہے، یہ تو پہلا سٹیج ہے۔ دوسری نوعیت وہ ہے جس کو آج کل first cousin کہا جاتا ہے، جیسے چچا کی اولاد یا پھوپھی کی اولاد، خالہ کی اولاد، ماموں کی اولاد، یعنی جہاں رشتہ دادا یا نانا پر جا کر مل رہا ہے، اس سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ آج کل جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، وہ اس میں پیدا ہو رہے ہیں اور اس میں بھی اولاد میں کوئی نقص پیدا ہونا کوئی ضروری نہیں ہوتا بلکہ نارمل شادیوں میں جتنے امکانات ہوتے ہیں اس سے تھوڑے سے زیادہ ہو جاتے ہیں اور وہ بھی عام طور پر زیادہ امکانات بیماریوں کے تب ہوتے ہیں جب کہ تسلسل سے یہ عمل دہرایا جائے یعنی نسل در نسل first cousins میں شادیاں ہوتی رہیں، تو اس میں یہ مسئلہ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ تیسری قسم کی رشتہ داریاں وہ ہیں جو اس سے بھی دور ہیں مثلاً دادا یا نانا پر جا کر رشتہ ملنے کی بجائے پردادا پر نانا میں جا کر رشتہ ملتا ہے تو اس طرح کی شادیاں عہد رسالت میں بہت کثرت سے ملتی ہیں، خود حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی شادی بھی اس کیٹیگری میں آتی ہے۔ دوسری کیٹیگری اور تیسری کیٹیگری میں شادی ممنوع تو نہیں ہے لیکن دوسری کیٹیگری میں چونکہ مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اگر لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ اس سے گریز کریں، خاص طور پر اس کے تسلسل سے گریز کریں تو اچھی بات ہے۔ اگر تیسری کیٹیگری میں بھی کسی جگہ مسائل پیدا ہونے لگیں اور قابل ذکر حد تک وہ مسائل ہوں تو وہاں پر بھی یہی بات کی جا سکتی ہے اور کسی جگہ یہ معاملات بہت زیادہ شدت اختیار کر جائیں تو وہاں قانون سازی بھی کی جا سکتی ہے لیکن بغیر قابل ذکر ضرورت کے قانون سازی کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ عام شعور پیدا کرنے کے ذریعے سے ہی یہ مسئلہ حل کرنا چاہیے۔

یہاں ایک بات اور بھی ہے کہ سماجی اعتبار سے بھی قریبی رشتہ داروں کے اندر شادیوں میں جہاں کچھ فوائد ہوتے ہیں کہ دیکھے بھالے ہوئے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے مزاج سے پہلے ہی واقفیت ہوتی ہے، وہیں بعض سماجی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں مثلاً پھوپھی یا چچا کے گھر رشتہ ہوا تو بہن بھائی کے پہلے جو مسئلے چلے آ رہے تھے، وہ مسئلے بعض اوقات اگلی نسل میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ اگلی نسل میں کوئی مسئلہ بنے تو اس کے اثرات بہن بھائیوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال شریعت کی نظر میں پہلی کیٹیگری کے علاوہ باقی قریبی رشتہ داروں میں نکاح کرنا ممنوع نہیں ہے۔ البتہ جس جگہ پر واقعتاً مسائل پیدا ہو رہے ہوں، وہاں

اگر لوگوں میں شعور پیدا کیا جائے تو اچھی بات ہے کہ وہ اس طرح کی جگہ پر شادیاں نہ کریں۔

۵۔ اگر عاقل بالغ لڑکا لڑکی کسی خطرناک بیماری مثلاً تھیلیسیمیا وغیرہ کا علم ہونے کے باوجود اپنی آزادانہ مرضی سے نکاح کرنا چاہے تو شرعاً کیا ایسے افراد کو اولاد کی مصلحت کی خاطر نکاح سے روکا جاسکتا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ اپنی آزادانہ مرضی سے نکاح کرنا مرد اور عورت کا حق ہے، جس طرح صحت مند اولاد نکاح کے مقاصد میں سے ہے، اسی طرح اپنی جنسی رغبت کو پورا کرنا بھی نکاح کے مقاصد میں سے ہے۔ لہٰذا جب تک کوئی مضبوط وجہ سامنے نہ آجائے، کسی کو اس کے حق کے استعمال سے روکنا خاص طور پر قانون سازی کے ذریعے روکنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ ریاست افراد کے معاملات میں بغیر کسی واضح ضرورت کے کسی قسم کی مداخلت نہ کرے، ہاں البتہ بعض اوقات جوڑا ایسا ہوتا ہے، ان کی خون کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کی باہمی شادی کی صورت میں تھیلیسیمیا کے حامل بچے پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو اس صورت میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ طبی طور پر اس طرح کی اولاد پیدا ہونے کے امکانات کتنے ہیں؟ اگر امکانات قابل ذکر ہیں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی نسل کی معذوری کی خاطر ان کو منع کرنے کی گنجائش ہونی چاہیے، چاہے سمجھا کر منع کیا جائے، سماجی اثر و رسوخ کے ذریعے مثلاً والدین سے کہلوا کر یا قانون سازی کے ذریعے۔ لیکن اگر ان میں باہمی تعلق اور قلبی تعلق کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ باز نہیں رہ سکتے تو پھر انہیں اس بات کی ترغیب دی جائے کہ وہ اولاد پیدا کرنے سے گریز کریں۔ اس طرح کی کوئی پابندی ان پر عائد کی جاسکتی ہے۔ کوئی ایسی مانع حمل تدبیر جس سے حمل ٹھہرنے کی مستقل صلاحیت ختم نہ ہو لیکن بہر حال وہ رکاوٹ بن جائے اولاد پیدا ہونے میں، اگر اس طریقے سے اس مسئلے سے بھی بچا جاسکے اور ان کا حق بھی پورا ہو جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

۶۔ اگر کسی شخص کی جنس پہلے کوئی اور تھی اور آپریشن کے نتیجہ میں اس کی جنس تبدیل ہوگئی، مثلاً پہلے وہ لڑکی تھی اور آپریشن کرکے اسے لڑکا بنا دیا گیا تو کیا نکاح میں اسے لڑکی تصور کیا جائے یا لڑکا تصور کیا جائے گا؟

فقہا نے خنثیٰ کے احکام پر جو بحث کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا دار و مدار مردانہ یا زنانہ خصوصیات پر ہے، یعنی موجودہ وقت میں مردانہ یا زنانہ خصوصیات میں سے زیادہ کون سی ہیں؟ اس کا اعتبار ہے، لہٰذا جس وقت کسی کی شادی کی جارہی ہے اس وقت دیکھا جانا چاہیے کہ اس میں کون سی خصوصیات زیادہ ہیں، مثلاً پہلے لڑکی تھی اور آپریشن کے بعد اسے لڑکا بنا دیا گیا تو اگر اس میں مردانہ خصوصیات مکمل ہیں، یا مردانہ خصوصیات غالب ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کو لڑکی تصور کرکے کسی اور لڑکے کے ساتھ نکاح کرانا تو عجیب سی بات ہو جائے گی اور یہ شریعت کے اصولوں کے خلاف ہو جائے گا اور ایک قسم کی ہم جنس پرستی کی شادی ہو جائے گی، لہٰذا اس کی شادی کسی لڑکی سے ہی ہو سکتی ہے، یعنی اسے مرد اور لڑکا ہی تصور کیا جانا چاہیے۔ عام طور پر جہاں جنس کی تبدیلی ہوتی ہے وہاں پہلے ہی سے دوسری جنس یا تبدیل شدہ جنس کی خصوصیات اس میں موجود ہوتی ہیں، مثلاً ایک لڑکی ہے، اس کو آپریشن کرکے اگر لڑکا بنایا گیا ہے تو اس میں پہلے ہی سے اگرچہ جسمانی ساخت اس کی لڑکیوں والی ہوتی ہے لیکن بہت سی خصوصیات اور رجحانات اس میں پہلے سے ہی لڑکوں والے موجود ہوتے ہیں تو آپریشن کرکے اس کو بین بین کیفیت سے نکال کر ایک طرف لگا دیا جاتا ہے، لہٰذا جو اس وقت اس کی پوزیشن ہے، اسی کا اعتبار ہونا چاہیے۔

۷۔ طلاق کی نیت سے شادی کا کیا حکم ہے؟ اور اس سلسلے میں نکاح کے ساتھ متعلق مقاصدِ شریعت کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

نکاح کرتے وقت اگر طلاق کی نیت ہے تو اس کو ہم دو صورتوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ مرد کے ذہن میں ہے کہ میں کچھ وقت اس کے ساتھ گزار کر اس کو طلاق دے دوں گا لیکن عورت کے ذہن میں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ میرے ساتھ ایک مستقل اور دائمی عقد ہو رہا ہے تو یہ تو بالکل ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ دوسرے فریق کو دھوکا دینا ہے لیکن اگر پہلے سے دونوں کے درمیان انڈر سٹینڈنگ موجود ہے، دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایک مخصوص وقت گزارنے کے بعد ہم نے طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہے تو شریعت کے مزاج کے مطابق اصل تو یہ ہے کہ یہ بھی کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے اس لیے کہ قرآن کریم نے نکاح کو "میثاقاً غلیظاً" یعنی ایک مضبوط عقد قرار دیا ہے، لہٰذا جب بھی یہ عہد اور عقد ہو تو اس کو نبھانے کی نیت سے ہونا چاہیے، ختم کرنے کی نیت سے نہیں ہونا چاہیے، البتہ عہدِ رسالت میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے اس کی اجازت دی گئی تھی لیکن وہ خاص ضرورتوں کے تحت تھی، مثلاً ہوتا یہ تھا کہ ایک آدمی کسی دوسرے شہر میں جاکر قیام پذیر ہوتا تھا تو ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہوٹل اور اس طرح کی دوسری سہولتیں موجود نہیں تھیں کہ آدمی ہوٹل میں کمرہ بک کرالے اور وہیں پر اس کے کھانے، لانڈری اور دوسری ضروریات کا انتظام ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے اسے ضرورت ہوتی تھی کسی جگہ رہائش اختیار کرے اور رہائش کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی ضروریات کو بھی پورا کرے، اس کا آسان حل یہ ہوتا تھا کہ وہ وہاں جاکر کسی خاتون سے نکاح کرلیتا تھا اور نکاح کے نتیجے میں اس خاتون کے اس کے ساتھ رہنے کا جواز بن جاتا تھا اور وہ خاتون اس کی ضرورتیں پوری کرتی تھی، جیسے کپڑے دھونا اور کھانا تیار کرنا۔ گویا اس خاتون کی رہائش گاہ اس کے لیے ایسی حیثیت کی حامل ہوتی تھی جسے آج کل کسی جگہ جاکر ہوٹل میں کمرہ بک کرالیا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں محدود وقت کے لیے اس کی اجازت دی گئی تھی، اگرچہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی اس روایت پر سند کے اعتبار سے کچھ کلام ہے، لیکن بہر حال متعدد علماء نے اس روایت کو اپنے بعض مواقف کی بنیاد بنایا ہے اب اس طرح کا جو عارضی بندوبست یا نکاح ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ تو اس کی ایک تفہیم یہ ہے کہ یہ منسوخ ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کا کوئی جواز باقی نہیں ہے۔ جواز

باقی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قانونی طور پر یعنی قضاءً تو یہ نکاح منعقد ہو جائے گا اور نکاح کے قانونی اثرات اس پر مرتب ہو جائیں گے لیکن ایسا کرنا جائز نہیں ہے، مزاج شریعت کے خلاف ہے۔ دوسری تفہیم یہ بھی ہے کہ یہ اجازت مخصوص حالات کی وجہ سے دی گئی تھی، جب تک وہ مخصوص حالات تھے تب تک تو اجازت تھی، جب وہ حالات نہیں تو وہ اجازت مرتفع ہو گئی۔ اس کو فقہا کی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ انتہاء المعلول بانتہاء العلۃ ہے، یعنی جس وجہ سے کوئی اجازت دی گئی تھی وہ وجہ ختم ہو گئی تو وہ اجازت بھی ختم ہو گئی۔ تو ایسی صورت میں وہ وجہ اگر دوبارہ لوٹ آئے تو اجازت بھی لوٹ آئے گی۔ شاہ ولی اللہ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تفہیم دوسری ہے، خاص طور پر شاہ ولی اللہؒ کی، کہ یہ حکم بالکل منسوخ نہیں ہے۔ اس حوالے سے اگر ہم آج کے زمانے میں دیکھیں تو یوں کہنا چاہیے کہ بغیر ضرورت کے تو اس طرح کے عقد کی طرف نہیں جانا چاہیے کیونکہ اسلام کی روح اور بنیادی مقاصد اور نکاح کے بنیادی تصور کے خلاف ہے، ہاں البتہ واقعتاً کسی جگہ اس طرح کی ضرورت متحقق ہو اور کوئی متبادل راستہ کسی انسان کے لیے موجود نہ ہو تو وہاں فقہا آج کل اس کے جواز پر غور کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں دو چیزوں کے درمیان فرق رہنا چاہیے۔ ایک یہ کہ اگر عقد نکاح کے اندر طلاق دینے کی شرط لگا دی جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح سے اگر عقد نکاح کے اندر یہ طے کر لیا جائے کہ اتنا پیریڈ ختم ہو جانے کے بعد یہ عقد خود بخود ختم ہو جائے گا تو یہ نکاح متعہ بنتا ہے اور اس میں وہی اختلاف ہے جو اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع کے ہاں موجود ہے کہ اہل سنت اسے منسوخ سمجھتے ہیں، جب کہ اہل تشیع اسے منسوخ نہیں سمجھتے، تو گویا تین صورتیں یہاں بن جاتی ہیں کہ ایک یہ کہ طے ہو کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد آٹومیٹک نکاح ختم ہو جائے گا۔ اہل سنت والجماعت کے ہاں یہ جائز نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ عقد نکاح کے اندر اس طرح کی شرط لگا لی جائے کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد میں طلاق دے دوں گا لیکن نکاح ختم طلاق دینے سے ہی ہو گا تو فقہائے حنفیہ کے ہاں اس طریقے سے نکاح تو منعقد ہو جائے گا اور نکاح پر اس کے قانونی اثرات تو مرتب ہو جائیں گے لیکن ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں کے ذہن میں یہ ہے کہ فلاں ضرورت پوری ہونے کے بعد یا اتنا وقت گزرنے کے بعد ایک دوسرے سے جدائی اختیار کر لی جائے گی اور خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا تو اس صورت میں قضاءً یعنی قانونی اثرات کے اعتبار سے تو سب کے ہاں یہ نکاح منعقد ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟ اس حوالے سے جو بات عرض کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بغیر ضرورت کے تو ایسا نہیں کرنا چاہیے، جہاں ضرورت اور مواقع ہوں، وہاں ضرورت کے حالات کے اعتبار سے سوچا جا سکتا ہے۔

۸۔ موجودہ دور میں طلاق کے حوالے سے افراط و تفریط کے واقعات بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ طلاق دینے والے کی نیت ایک طلاق کی ہوتی ہے لیکن جس مروج طلاق نامے پر وہ دستخط کرتا ہے اس میں تین طلاقوں کا ذکر ہوتا ہے، بسا اوقات دستخط کرنے والا طلاق نامے کو پڑھتا بھی نہیں تو ایسی صورت حال میں فقہ حنفی کی رو سے کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

زبانی طلاق دینے میں اور لکھ کر طلاق دینے میں فقہا کے ہاں کچھ فرق ہے اور اس میں خاصی تفصیلات ہیں۔ ہر فقہ میں احکامات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ فقہائے حنفیہ کا نقطہ نظر اس حوالے سے یہ ہے کہ طلاق دینے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ وہ زبان سے دی جائے۔ زبان سے اگر طلاق دی گئی تو وہ مجبوری میں دی گئی ، ہنسی مذاق میں دی گئی ہو ی، اس کی طلاق دینے کی نیت تھی یا نہیں تھی، ہر حال میں اس کے ظاہری الفاظ کے مطابق قضاءً وہ طلاق واقع ہو جائے گی۔ البتہ لکھ کر طلاق دینا حنفیہ کے ہاں ثانوی درجے کا طریقہ ہے۔ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ کتابت عبارت کے قائم مقام ضرورت کی وجہ سے ہوتی ہے، لہٰذا جہاں ضرورت کا تحقق ہو وہاں لکھ کر دینے سے طلاق واقع ہو جائے گی اور جہاں ضرورت کا تحقق نہ ہو وہاں کتابت عبارت کے قائم مقام نہیں ہو گی اور طلاق واقع نہیں ہو گی، لہٰذا اگر کسی آدمی نے لکھی ہوئی طلاق پر دستخط کیے ہیں اور وہ دستخط کسی مجبوری میں کیے ہیں، چاہے پڑھ کر کیے یا پڑھے بغیر کیے تو حنفیہ کے اس اصول کے مطابق طلاق واقع نہیں ہو گی۔ اسی طریقے سے دستخط کرتے وقت اگر اس کی طلاق دینے کی نیت نہیں تھی، اس کو فقہا کی زبان میں طلاق الہازل کہتے ہیں تو اگر زبان سے دی ہوتی تو یہ طلاق منعقد ہو جاتی تھی لیکن یہاں لکھ کر دینے کی صورت میں یہ طلاق منعقد نہیں ہو گی۔ اس لیے چونکہ اس کا طلاق دینے کا ارادہ ہی نہیں ہے، اس لیے یہاں کتابت کو عبارت کے قائم مقام قرار دینے کی یعنی لکھنے کو تلفظ کے قائم مقام قرار دینے کی ضرورت نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا مذکورہ سوال میں اگر کسی آدمی نے طلاق نامے پر یہ سمجھ کر دستخط کیے کہ اس میں ایک ہی طلاق ہے اور اس نے اس کو پڑھا نہیں ہے اور اس کی نیت یہ تھی کہ میں ایک طلاق دینا چاہتا ہوں تو اگرچہ اس تحریر پر تین طلاقیں لکھی ہوئی ہوں لیکن وہ ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔ دیانتاً اس کا حکم یہ ہے خاوند کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ رہنا جائز ہے اور اگر بیوی کو اعتماد ہو کہ میرا خاوند درست کہہ رہا ہے تو اس کے لیے بھی اس کے ساتھ رہنا جائز ہو گا۔